ڈھائی سو سالہ انسان

تحریر رہبر معظم سید علی خامنہ ای

جلد اول

بین الاقوامی ادارہ فروغ فکر و عمل

ڈھائی سو سالہ انسان

ترجمہ کتاب انسان ۲۵۰ سالہ

جلد اوّل

مترجم: سید مہدی رضوی

ڈھائی سو سالہ انسان۔۔۔۔ تحریر رہبر معظم سید علی خامنہ ای

ناشر: بین الاقوامی ادارہِ فروغِ فکر و عمل

کتاب : ڈھائی سو سالہ انسان جلد اول

ترجمہ انسان ۲۵۰ سالہ

زبان : اردو

تحریر : رہبر معظم سید علی خامنہ ای

مترجم : مہدی رضوی

سن اشاعت : اگست ۲۰۱۶

ناشر : بین الاقوامی ادارہ فروغ فکر و عمل

ملنے کا پتہ : https://telegram.me/rehber_syedali

: effainternational.blog.ir

: Effa110@gmail.com

قیمت : صلوات بر محمد و آلِ محمد

ڈھائی سو سالہ انسان۔۔۔۔ تحریر رہبر معظم سید علی خامنہ ای

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اور ان کی خواہر جناب زینب سلام اللہ علیہا کے نام کرتا ہوں.

مترجم

مقدمہ

اہل بیت علیہم السلام کی غربت اور مظلومیت فقط اُن کی (ظاہری) زندگی تک محدود نہیں ہے۔ ظاہری زندگی سے لے کر آج تک اُن کی زندگی کے اہم بلکہ شاید اصلی پہلوؤں کی طرف عدم توجہی نے اُن کی تاریخی غربت کو گذشتہ تمام صدیوں میں روز اول کی طرح باقی رکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دوران لکھی جانے والی کتابیں بے نظیر اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ ان میں اہل بیت علیہم السلام کی زندگی کے مختلف گوشے محفوظ ہو کر اگلی نسلوں تک میراث میں پہنچے ہیں۔ لیکن اہل بیت علیہم السلام کی زندگی کا سیاسی پہلو، ان کی سیاسی جدوجہد جو ان کی ظاہری زندگی کے ۲۵۰ سالوں میں بلا توقف جاری رہی، ان کے علمی اور معنوی پہلوؤں کے درمیان کہیں کھو گیا ہے[1]۔

ضروری ہے کہ ہم اہل بیت علیہم السلام کی زندگی پر صرف فخر و مباہات کرنے کے بجائے اسے اپنی زندگی کیلئے نمونہِ عمل بنائیں اور یہ کام ان کی سیاسی روش کی طرف توجہ کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ میں شخصی طور پر اس پہلو کی طرف خاص رغبت رکھتا ہوں۔ میں سن ۱۳۵۰ (۱۹۷۲) میں ایک بہت ہی سخت امتحان کے دوران پہلی بار اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس بات سے غافل نہیں تھا کہ تمام آئمہ (ع) اپنی تمام عمر کلمہِ توحید کی سربلندی اور حکومتِ الٰہی کے قیام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے ہیں اور اس راہ میں قربانیاں دیتے رہے ہیں۔

[1] یعنی محققین اور محبین نے قلم فرسائی کے دوران آئمہ کی زندگی کے سیاسی پہلووں سے بے اعتنائی برتی اور صرف ان کے معنوی، اخلاقی اور علمی پہلووں کو اجاگر کیا گیا نتیجتاً آئمہ کی زندگی کا یہ گوشہ تشنہِ تحریر رہا۔

لیکن جو نکتہ اس وقت یکا یک میرے لئے روشن ہوا وہ یہ تھا کہ آئمہ (ع) کی زندگی ظاہری فرق کے باوجود، کہ جس کی وجہ سے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اماموں کی سیرت میں تضاد کے قائل ہو جاتے ہیں، مجموعی طور پر ایک ہی ہے۔ ۲۵۰ سالوں پر مشتمل یہ طویل جدجہد ۱۰ یا ۱۱ ہجری ۲۶۰ ہجری میں غیبت صغریٰ کے آغاز تک پھیلی ہوئی ہے۔

تمام آئمہ (ع) ایک جیسی شخصیت کے حامل ہیں۔ بلاشبہ تمام آتمہ کا ہدف اور راستہ ایک ہے پس اس کے بجائے کے ہم امام حسن (ع) امام حسین (ع) اور امام سجاد (ع) کی سیرت کا الگ الگ مطالعہ کریں، [جب کہ اس میں یہ خطرہ موجود ہے کہ ظاہری تفاوت کی وجہ سے ہم سیرتوں میں تضاد کے قائل ہو جائیں] کیوں نہ ہم یہ فرض کریں کہ ایک ہی انسان ہے جس نے ۲۵۰ سال عمر گذاری ہے اس انسان نے 11 ہجری میں ایک راستے کی طرف قدم اُٹھایا تھا اور ۲۶۰ ہجری تک اسی راستے کو طے کرتا رہا ہے۔

اس بلند مرتبہ اور معصوم انسان کے تمام افعال صرف اسی نقطہ نظر کے مطابق قابل فہم اور قابل توجیہ ہیں۔ ہر عقل و حکمت رکھنے والا انسان اگرچہ غیر معصوم ہی کیوں نہ ہو، طویل جدوجہد کے دوران مختلف اوقات میں دسیوں حکمت عملیوں کو اختیار کرتا ہے۔ ایک ہی ہدف کی طرف بڑھتے ہوئے حالات کے مدّ نظر کبھی اس کی رفتار تیز ہوتی ہے اور کبھی وہ خراماں خراماں منزل کی سمت قدم بڑھاتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے لیکن جو لوگ اس کے ہدف سے، اس کے علم و حکمت سے واقف ہیں وہ اس عقب نشینی کو بھی حکیمانہ اور مقصد کی جانب ہی شمار کرتے ہیں۔ اس نگاہ سے دیکھیں تو امیر المومنین (ع) کی زندگی، امام حسن (ع) کی زندگی، امام حسین (ع) کی زندگی اور باقی آٹھ اماموں کی زندگی در حقیقت ایک ہی منزل کے حصول کے لئے وقت اور حالات کے مطابق بدلتی ہوئی حکمت عملیوں کا منہ بولتا

ثبوت محسوس ہو گی[1]۔ اس سال میں اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس نظر کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کی زندگی کا مطالعہ شروع کیا۔ جتنا آگے بڑھتا گیا اتنی ہی اس نظر کی تائید ہوتی گئی۔ آئمہ علیہم السلام کی اس باہم پیوستہ[2] زندگی میں ایک چیز جو ہمیشہ نظر آتی ہے وہ ان کی سیاسی جد وجہد اور ان کے سیاسی نظریات و اعمال ہیں لٰہذا ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو مستقل طور پر مورد توجہ قرار دیا جائے۔ میں انشاءاللہ اس مطلب کی طرف توجہ دلاتا رہوں گا۔ فی الحال ہم اس موضوع پر بات شروع کرتے ہیں، اول یہ کہ ہم جو سیاسی جدوجہد کو آئمہ (ع) کی طرف نسبت دیتے ہیں اس سے ہماری مراد کیا ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نسبت کے سبب ہم کہہ سکتے ہیں کہ، عام طور سے تاریخ میں پائے جانے والے اعتقادی و کلامی مکاتب مثلا اشاعرہ و معتزلہ کے برعکس، اماموں کی جدوجہد صرف علمی، اعتقادی اور کلامی محاذوں تک محدود نہیں تھی۔

دروس کی مجالس سے اور احکام و معارف کے بیان سے آئمہ (ع) کا مقصد فقط یہ نہیں تھا کہ اپنے کلامی یا فقہی مکتب کی حقانیت کو صد در صد ثابت کر کے مخالفین کو خاموش کرا دیں۔ بلکہ ہدف اس سے کہیں زیادہ بلند اور دور رس نتائج کا حامل تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ مسلح

---

[1] یعنی اس میں فرق نہیں پایا جائے گا کہ امام حسن نے صلح کی اور امام حسین نے جنگ تو ان دونوں کی سیرت اور کردار میں کوئی فرق تھا نہیں بلکہ با آسانی یہ نتیجہ لیا جائے گا کہ ایک ہی شخص ایک وقت میں جب وسائل مہیا نہ ہوں تو خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے دشمن کی جانب سے کئے جانے والے ظلم و ستم کو برداشت کرتا ہے تا وقتیکہ مواقع فراہم ہو جاتے ہیں اور زمین ہموار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے دشمن کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

[2] یعنی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی زندگی جس میں ہم امام کو ایک ہی انسان تصور کریں اور مختلف اوقات اور حالات میں اس کی مختلف سرگرمیوں کا مطالعہ کریں

جدوجہد جو ہمیں جناب زید اور ان کے لواحقین، آل حسن، بعض آل جعفر یا دوسروں کی زندگی میں نظر آتی ہے، آئمہ علیہم السلام کی زندگی میں موجود نہیں ہے۔ البتہ آئمہ (ع) نے ان تمام تحریکوں کی مکمل نفی بھی نہیں کی ۔ اِن میں سے بعض سے بیزاری کا اظہار ضرور کیا ہے لیکن اس کی علّت اِن کا مسلح ہونا نہیں ہے۔ دوسری طرف بعض کی مکمل تائید فرمائی ہے یہاں تک کہ بعض کی پشت پناہی بھی کی ہے۔ (لوددتُ أنَّ الخارِ بیَّ مِن آل محمد فرج و علیَّ نَفَقَهُ عیاله)[1]۔ مثلاً اُن کی مالی مدد، معاشرے میں ان کا اعتبار بڑھانا، چھپنے کے لئے جگہ فراہم کرنا اور اس طرح کی دوسری امداد لیکن آئمہ (ع) بحیثیت امام خود کسی مسلح جدوجہد میں شریک نہیں ہوئے ہیں۔ (ہم جس سیاسی جدوجہد کی بات کر رہے ہیں) اس سے مراد نہ وہ پہلی جدوجہد (مسلح قیام) ہے اور نہ ہی دوسری (مسلح تحریک کی پشت پناہی) بلکہ جو مراد ہے وہ ایک سیاسی ہدف کے حصول کے لئے کوشش کرنا ہے۔ وہ سیاسی ہدف کیا ہے؟ وہ سیاسی ہدف حکومت اسلامی کی تشکیل ہے، یعنی ہماری تعبیر کے مطابق حکومت علوی کی تشکیل۔ آئمہ (ع) رسول اکرم (ص) کی وفات سے لیکر ۲۶۰ ہجری تک اس بات کے لئے کوشاں رہے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اسلامی حکومت قائم کریں۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی کوشش اپنے زمانے میں ہی حکومت اسلامی کے قیام کے لئے تھی، یعنی ہر امام کی کوشش تھی کہ اُن کے زمانے میں ہی حکومت اسلامی قائم ہو جائے۔ مثال کے طور پر امام مجتبیٰ (ع) کی کوشش مستقبل قریب[2] میں حکومت اسلامی کے قیام کے لئے تھی۔ جب مسیّب بن نجبہ اور دوسروں نے امام مجتبیٰ (ع) سے اُن کے سکوت

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۱۷۲، (میں اس بات کو محبوب رکھتاہوں کہ آل محمد میں سے کوئی خروج کرے اور اس کے اہل و عیال کا نفقہ میرے اوپر ہو)

[2] Short term

کے بارے میں سوال کیا تو امام(ع) نے اُن کے جواب میں فرمایا(**وإن أدری لعلّہ فِتنة لَّکم و متاع إلی حین**)[1]۔ امام سجاد کے زمانے میں[2]، امام کی کوشش مستقبل وسط[3] کے لئے تھی۔ انشاءاللہ ہم اس بات کو شواہد کی روشنی میں ثابت کریں گے۔ امام باقر(ع) کی کوشش، قوی احتمال ہے کہ مستقبل قریب میں حکومت کے قیام کے لئے تھی۔ آٹھویں امام(ع) کی شہادت کے بعد، قوی گمان ہے کہ کوششیں مستقبل بعید[4] میں حکومت کے قیام کے لئے تھیں۔ کس زمانے میں حکومت کا قیام؟ زمانے مختلف ہیں لیکن حکومت کے قیام کے لئے کوشش ہمیشہ موجود ہے۔ یہی سیاسی جدوجہد آئمہ (ع) کے تمام کاموں میں، سوائے ان کے جو انسان کے نفس کی ارتقاء اور قرب خدا سے مربوط ہیں (بینہ و بین رَبِّہ)، نظر آتی ہے۔یعنی درس، حدیث، علم، کلام، علمی اور سیاسی مخالفین سے بحث و مناظرہ، ملک بدری، ایک گروہ کی حمایت اور ایک کی مخالفت یہ سب کام اسی ایک ہدف یعنی اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے ہیں۔

آیا آئمہ (ع) کی کوئی سیاسی زندگی بھی تھی؟۔ یا اُن کی زندگی فقط اس چیز تک محدود تھی کہ چند شاگرد، چند مرید، چند چاہنے والے اپنے گرد جمع کریں اور نماز، زکوۃ اور حج کے احکام بیان کریں، اسلامی اخلاقیات، اصول دین اور عرفان سمجھائیں اور بس؟ یا نہیں بلکہ ان چیزوں کے علاوہ، ایک اور شے ہے جو ان سب چیزوں کی روح ہے اور وہ آئمہ (ع) کی سیاسی زندگی ہے؟ یہ بہت اہم مطلب ہے جو واضح ہونا چاہیے۔ البتہ اس مختصر وقت میں مناسب نہیں ہے کہ اس بحث کی

---

[۱] انبیا /۱۱۱،(اور میں کچھ نہیں جانتا شاید یہ تاخیر عذاب بھی ایک طرح کا امتحاں ہو یا ایک معین مدت کا آرام ہو)ز

[2] میری فکر اور سوچ کے مطابق

[3] مستقبل قریب اور بعید کا اوسط middle term

[4] Long term

استدلالی تحلیل کی جائے۔ میں یہاں اہم ترین مطالب بیان کروں گا تاکہ بعد میں اس موضوع میں دلچسپی رکھنے والے آئیں اور اس نہج پر روایات اور تاریخ کا مطالعہ کریں؛اُس وقت پتہ چلے گا کہ امام موسیٰ ابن جعفر (ع) یا دوسرے آئمہ کی زندگی کی حقیقت کیا ہے کہ جو آج بھی مبہم، اَن کہی اور ناشناختہ ہے۔ جب آئمہ (ع) کو احساس ہوا کہ پیغمبر اکرم (ص) کا ہدف مکمل نہیں ہوا ہے یعنی (یزکیھم و یعَلِّمھم الکتاب و الحکمۃ)[1] سرانجام کو نہیں پہنچا۔ جب دیکھا کہ نظام اسلامی کی تشکیل اور اسلامی دنیا کا وجود جس طرح پیغمبر اکرم (ص) چاہتے تھے، صدر اسلام کے بعد مکمل طور پر بھلا دیئے گئے ہیں، نبوت اور امامت کی جگہ ملوکیت نے لے لی ہے، قیصر، پرویز اور تاریخ کے دوسرے نامدار طاغوت اور جبّار، جانشین پیغمبر (ص) اور خلافت کے لبادے میں، بنی عباس اور بنی امیہ کے سلسلے سے بر سر اقتدار آگئے ہیں۔ قرآن کی ارباب ملک و قدرت کی خواہشات کے مطابق تفسیر کی جارہی ہے ،اور لوگوں کے ذہن حکومتی کارندوں کے نمک خوار عالموں کی خیانت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ تو اس سے مقابلے کے لئے آئمہ نے ایک جامع منصوبہ بندی کی جو ان کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔

آئمہ سے مراد تمام امام ہیں۔ حضرت علی (ع) سے لیکر امام حسن عسکری (ع) تک۔ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ آئمہ (ع) کی زندگی جو ۲۵۰ سال کی مدّت پر محیط ہے، ایک انسان کی زندگی حساب ہونی چاہیے، ایک ۲۵۰ سال کا انسان۔ آئمہ (ع) ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں (کلّھم نور واحد)۔ جو ایک کی بات ہے حقیقتاً وہی دوسروں کی بات ہے، جو ایک کا کام ہے حقیقتاً وہی دوسروں کا بھی ہے۔ گویا ایک ہی انسان ہے جس نے ۲۵۰ سال عمر گزاری ہے۔

---

[1] آل عمران / ۱۶۴ (۔۔ انہیں پاکیزہ بناتا ہے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

ان ۲۵۰ سالوں میں آئمہ (ع) کے تمام کام ایک ۲۵۰ سالہ انسان کے کام ہیں، ایک ہدف اور ایک نیت کے ساتھ البتہ حکمت عملی اور تدابیر مختلف ہیں۔

جب آئمہ (ع) نے دیکھا کہ اسلام غربت میں ڈوبتا جارہا ہے اور اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں دیا جا سکا تو انہوں نے اپنے لئے چند اصولی اہداف مقرر کیے۔ ایک ؛اسلام کے صحیح چہرے کا تعارف۔ طویل مدت تک بر سر اقتدار رہنے والوں کی نگاہوں میں اسلام ایک رکاوٹ تھا۔ پیغمبر کا اسلام، قرآن کا اسلام، جنگ بدر و حنین کا اسلام، تجمل پرستی کا مخالف اسلام، طبقاتی نظام کو اکھاڑ پھینکنے والا اسلام، محروموں اور مظلوموں کا طرفدار اور مستکبروں پر ضرب کاری اسلام۔ ایسا اسلام اُن[1] کے کس کام کا جو فرعونی حقیقت میں موسوی لباس، نمرودی حقیقت میں ابراہیمی لباس پہنّا چاہتے ہیں، پس وہ مجبور تھے کہ اسلام میں تحریف کریں۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسلام کو لوگوں کے دل و ذہن سے یکسر محو کر دیں اس لیے تنہا چارہ یہی تھا کہ اسلام کی روح کو، اس کی حقیقت کو، اس کی ماہیت کو اس سے جدا کر دیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ یہ وہی کام ہے کہ جسے گذشتہ شہنشاہی نظام[2] میں اسلامی شعائر کے ساتھ ہوتا آپ خود دیکھ چکے ہیں۔ گذشتہ نظام میں اسلام کے آداب و رسومات کی مخالفت نہیں ہوتی تھی۔ مخالفت ہوتی تھی تو اسلام کی روح کی، اس کے معنی کی، اس کے جہاد کی، اس کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی، اس کے حقائق کے بیان کی مخالفت ہوتی تھی۔

---

[1] صاحب اقتدار بنو امیہ و بنو عباس وغیرہ

[2] انقلاب اسلامی سے پہلے کا پہلوی شاہی نظام حکومت

اسلام کے ظاہری احکامات جو ان کی دنیا کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتے، ان کی کوئی مخالفت نہیں ہوتی تھی۔ یہی حالت اموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں بھی تھی یعنی اسلام کو اس کی حقیقت سے جدا کرنے کیلئے ان کے پاس خریدے ہوئے قلم اور بکی ہوئی زبانیں موجود تھیں۔ یہ پیسے دیتے تھے، ان کے لئے حدیث گڑھی جاتی تھی، پیسے دیتے تھے: ان کے لئے قصیدے لکھے جاتے تھے، پیسوں کی بنیاد پر ان کے لئے کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ لکھا ہے کہ جب سلیمان بن عبد الملک دنیا سے گیا اس کے خزانے سے فلاں بزرگ عالم، میں ان کا نام نہیں لوں گا، کی اتنی کتابیں نکلیں کہ انہیں خچروں پر بار کیا گیا۔ یعنی یہ مصنف، یہ بزرگ محدث، یہ معروف عالم، جن کا نام جابجا اسلامی کتابوں میں ملتا ہے، سلیمان بن عبد الملک کے لیے کتابیں لکھتے تھے۔ جو کتابیں سلیمان بن عبد الملک کے لئے لکھی جائیں کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان میں ایسی چیزیں موجود ہوں گی کہ جو سلیمان بن عبد الملک پر ناگوار گذریں؟ سلیمان بن عبد الملک جو ظلم کرتا ہے، شراب پیتا ہے، کفار سے راہ ورسم رکھتا ہے، مسلمانوں کو آزار دیتا ہے ، لوگوں کے درمیان فرق کا قائل ہے، لوگوں کے اموال غصب کرتا ہے، فقرا کو پیروں تلے روندتا ہے، اس کو کون سا اسلام پسند آئے گا؟ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں یہ اسلامی معاشرے میں پھیلا ہوا ایک طاعون تھا۔ آئمہ (ع) اس چیز کو دیکھ رہے تھے اور اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ پیغمبر اکرم (ص) کی گراں قدر میراث ضائع کی جارہی ہے۔ یعنی اسلامی احکام ، جن کا تاریخ میں باقی رہنا اور عرصہِ تاریخ میں ہدایت کا کردار ادا کرنا ضروری ہے، تحریف کی زد میں آچکے ہیں۔ اس بنیاد پر آئمہ (ع) کے اہداف میں سے ایک بہت اہم ہدف یہ تھا کہ تحریف اور تحریف کرنے والوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اسلام کی صحیح تصویر اور قرآن کی حقیقی تفسیر بیان کریں۔

آئمہ (ع) کے کلام میں ہمیں جابجا نظر آتا ہے کہ آئمہ (ع) نے درباری علماء، فقہا اور محدثین کی طرف سے اسلام سے منسوب کی جانے والی چیزوں کو ردّ کرتے ہوئے حقائق کو واضح کیا۔ پس آئمہ (ع) کا ایک اصلی اور اہم ہدف اسلامی احکام کو (صحیح طریقہ سے) اجاگر کرنا تھا۔ یہ کام خود سیاسی شکل و صورت کا حامل ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ تحریف سلطانوں اور حکمرانوں کی ایماء پر کی جاتی تھی، اُن کے خریدے ہوئے عالم نما لیکن در حقیقت غلام اور نفس فروش بکاؤ افراد کے قلم ان کے مفاد کی خاطر تحریف کیا کرتے تھے۔ اس حالت میں اگر کوئی ان تحریفات کے خلاف قدم اٹھائے تو اس کا یہ قدم حکام اور سلاطین کے خلاف محسوب ہو گا۔ آج بھی اگر بعض ممالک میں درباری علماء اور خود فروش مصنفین اجرتیں لے کر مسلمانوں میں تفرقہ ایجاد کرنے کیلئے یا اپنے مسلمان بھائیوں کا چہرہ مسخ کرنے کیلئے کتابیں لکھتے ہیں، ان ممالک میں اگر کوئی آزاد منش مصنف وحدت اسلامی و اسلامی جماعتوں کے مابین برادری کے بارے میں قلم فرسائی کرے، کوئی کتاب لکھے تو اس کا یہ عمل، سیاسی عمل اور حکومت مخالف کام محسوب ہو گا۔ پس آئمہ کی ایک بڑی اور اہم فعالیت احکام کا بیان تھا۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس وقت کے اسلامی معاشرے میں احکام بیان نہیں ہوتے تھے۔ دنیائے اسلام کے ہر گوشہ و کنار میں قرآن بیان کرنے والے، حدیث بیان کرنے والے، پیغمبر سے نقل کرنے والے موجود تھے۔ بعض محدثین تو ایسے تھے کہ جنہیں ہزاروں حدیثیں حفظ تھیں اور یہ قضیہ فقط مکہ، مدینہ، کوفہ و بغداد سے مخصوص نہیں تھا بلکہ عالم اسلام کے تمام شہروں کا یہی حال تھا۔ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ مثلاً خراسان میں فلاں نوجوان دانشمند نے کئی ہزار حدیثیں تدوین کی ہیں، طبرستان میں فلاں بزرگ عالم نے پیغمبر اکرم (ص) اور صحابہ اکرام سے کئی ہزار حدیثیں نقل کی ہیں۔ حدیث موجود تھی، حکم اسلامی بیان ہوتا تھا جو چیز بیان نہیں ہوتی تھی وہ اسلامی معاشرے سے مربوط

تمام امور میں اسلام کی صحیح تفسیر تھی۔ آئمہ (ع) اسی سکوت کو توڑنا چاہتے تھے اور یہ ان کے اہم کاموں میں سے ایک تھا۔

آئمہ (ع) کا ایک اور اہم کام مسئلہ امامت کو واضح کرنا تھا۔ امامت یعنی اسلامی معاشرے کی حکومت اور زمام داری۔ ایک اہم مسئلہ جو اس زمانے کے مسلمانوں کے لئے روشن نہیں تھا اور نظریاتی اعتبار سے بھی تحریف کا شکار ہو چکا تھا وہ یہی مسئلہ امامت تھا۔ یعنی اسلامی معاشرے کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ معاملہ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ وہ لوگ جو بیشتر اسلامی احکام پر عمل نہیں کیا کرتے تھے اور اکثر محرمات کو کھلے عام انجام دیا کرتے تھے بغیر شرم و حیا مسند رسول (ص) پر بیٹھ کر پیغمبر (ص) کی جانشینی کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگوں کو اس کی خبر نہیں تھی بلکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ خلیفہ نشہ کی حالت میں جمعہ کی نماز پڑھا رہا ہے لیکن پھر بھی اس کی اقتدا کرتے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ یزید بن معاویہ بڑی بڑی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہے اور بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن جب یزید کے خلاف قیام کے لئے کہا جاتا تو وہ جواب دیتے کہ ہم نے یزید کی بیعت کی ہے۔ مسئلہِ امامت لوگوں کے لئے روشن نہیں تھا اُن کی نظر میں اس میں قباحت نہیں تھی کہ اسلامی معاشرے کا حاکم اتنے گناہوں اور مظالم سے آلودہ ہو اور جن کاموں کو قرآن اور اسلام نے صراحت سے منع کیا ہے انہیں انجام دیتا ہو اُن کی نظر میں یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ اُس معاشرے کی ایک بہت بڑی مشکل تھی اور حکومت کے قیام و دوام میں حاکم کے اثر و رسوخ کی وجہ سے جو خطرہ در پیش تھا اس سے مقابلہ کیلئے آئمہ (ع) ضروری سمجھتے تھے کہ ان دو چیزوں کو لوگوں پر واضح کر دیا جائے۔

ایک یہ کہ اسلامی حاکم کو، امام کو کن خصوصیات و شرائط کا حامل ہونا چاہیے۔ امام یعنی اسلامی حاکم کی خصوصیات، من جملہ، تقویٰ، علم، معنویت، لوگوں سے برتاؤ، خدا سے رابطہ وغیرہ کو لوگوں کے لئے بیان فرماتے تھے۔ ایک یہ کام اور دوسرا اس چیز کا بیان کہ آج ان خصوصیات کا حامل کون ہے؟ اس عنوان سے اپنا تعارف کراتے تھے۔ یہ آئمہ (ع) کا ایک بہت اہم کام تھا۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے یہ کام، سیاسی تبلیغات [1] اور تعلیمات [2] کے اہم ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اگر آئمہ (ع) کی زندگی میں ان دو کاموں کے علاوہ کچھ اور نہ ہوتا تب بھی ہم آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ آئمہ (ع) کی زندگی، شروع سے لے کر آخر تک، ایک سیاسی زندگی تھی۔ جب تفسیر بیان کرتے، معارف اسلامی بیان کرتے تو درحقیقت اس وقت بھی سیاسی کام انجام دے رہے ہوتے تھے۔ جب امام کی خصوصیات بیان کرتے تو وہ بھی ایک سیاسی عمل کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ اگر آئمہ (ع) کی تعلیمات صرف ان دو موضوعات میں خلاصہ ہو جاتیں تب بھی کہا جا سکتا تھا کہ آئمہ کی زندگی سیاسی زندگی تھی۔ لیکن آئمہ نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ آئمہ کی زندگی میں، یا کم از کم امام حسن علیہ السلام کے زمانے سے ہمیں آئمہ کی زندگی میں ایسی خفیہ سیاسی اور انقلابی تحریک نظر آتی ہے جس کا مقصد حکومت حاصل کرنا ہے۔ آئمہ (ع) کی زندگی کے بارے میں تحقیق کرنے والے کیلئے یہ بات ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آئمہ کی زندگی میں یہ تحریک موجود تھی۔ البتہ ابھی تک یہ نکتہ (اکثر افراد کیلئے) روشن نہیں ہے، واقعہ کا یہ رخ آئمہ کی زندگی پر لکھی جانے والی کتابوں میں بیان نہیں ہوا۔ امام صادق علیہ السلام، امام

---

[1] Political campaign

[2] Political science

موسی بن جعفر علیہما السلام اور دوسرے آئمہ (ع) کی زندگی کا یہ پہلو ان پر لکھی جانے والی کتابوں سے غائب ہے اور اتنے شواہد کے باوجود یہ بات کہ آئمہ (ع) ہمیشہ وسیع اور منظم سیاسی جدوجہد کرتے رہے ہیں، نگاہوں سے اوجھل رہی اور آج آئمہ کی زندگی کو سمجھنے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس جدوجہد کے شواہد بہت زیادہ ہیں پس بطور خلاصہ ہم سب کو یہ جان لینا چاہیے کہ بار امامت کاندھوں پر آتے ہی آئمہ فوراً جن کاموں کو شروع کیا کرتے تھے اُن میں سے ایک یہی سیاسی جدوجہد ہے۔ حکومت حاصل کرنے کی غرض سے جو بھی لوگ جدوجہد کرنا چاہتے ہیں اُن کیلئے لازم ہے کہ دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ سیاسی فعالیت بھی ضرور انجام دیں۔ آئمہ (ع) کی سیاسی جدوجہد بھی اسی ہدف کے لئے تھی۔

آئمہ (ع) کی زندگی میں ہمیں اُن کے اور حکمرانوں کے درمیان جو تنازعے نظر آتے ہے وہ اسی وجہ سے ہیں۔ ارباب اقتدار جو آئمہ کی مخالفت کرتے تھے، انہیں زہر دیتے تھے، قتل کرتے تھے، زندانوں میں ڈلوادیتے تھے، نظر بند کر دیا کرتے تھے ان کی دشمنی آئمہ کے اسی حکومت کے دعوے کی وجہ سے تھی۔ اگر آئمہ حقِ حکومت کا دعویٰ نا کرتے، کسی قسم کی سیاسی قدرت نہ رکھتے، پھر چاہے اولین اور آخرین کے علم کو اپنی طرف نسبت دیتے، اُن کی کوئی مخالفت نہیں ہوتی یا کم سے کم، اس شدّت کے ساتھ مخالفت نہیں ہوتی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آئمہ کی تبلیغ میں، اُن کی دعوتِ حق میں مسئلہ امامت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ جب امام صادق علیہ السلام اپنی سیاسی قدرت اور اسلامی میزان کے مطابق اپنی حاکمیت کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس طرح فرماتے ہیں "ایّها النّاسُ إنّ رَسـول الله کان الامام"[1]، عرفات کے مجمع میں، لوگوں کے

---

[1] الکافی، ج ۴، ص ٤٦٦

درمیان کھڑے ہو کر فرمارہے ہیں، "اِنَّ رســول الله کانَ الامام" معاشرے کے پیشوا، اُس کے رہبر، اس کے امام، اس پر حاکم، رسول خدا (ص) تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں، "ثُمَّ کان علیّ بنُ ابی طالب ثُمَّ الحسن ثُمَّ الحسین"۔ رسول اکرم (ص) کے بعد امام علی (ع) امام تھے، اس کے بعد امام حسن، یہاں تک کے اس سلسلے کو خود تک پہنچاتے ہیں۔ پس آئمہ (ع) کی بحث اپنے مخالفین کے ساتھ تنہا اسی حکومت اور مسلمانوں پر عام و خاص ولایت کے مسئلہ پر تھی۔ اصحابِ آئمہ کی حکومت مخالف جدوجہد کا محور بھی یہی مسئلہ تھا۔ معنوی مقامات پر حکومت کی آئمہ کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں تھی۔

تاریخ میں تواتر کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ جو لوگ خلفاء کے زمانے میں اہل علم تھے، اہل زہد تھے، تفسیر اور اس طرح کے علوم کے حوالے سے معروف تھے، خلفاء نا صرف اُن کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ مخلص تھے، اُن سے ارادت کا اظہار کرتے تھے، ان کے پاس جا کر اُن سے نصیحت طلب کرتے تھے۔ کیوں؟ کیونکہ ان کا خلفاء کے ساتھ سیاسی قدرت کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ حسن بصری، ابن شُبرُمہ، عمرو بن عبید اور اس طرح کے دوسرے بزرگان خلفاء کے مورد قبول اور مورد توجہ علماء تھے۔ یہ سب علم، زہد، معنویت، تفسیر اور دیگر علوم میں پیغمبر (ص) کے ورثہ دار ہونے کے دعویدار تھے۔ لیکن ان کی نسبت خلفاء کی طرف سے کوئی تعرض نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ بزرگان کوئی سیاسی دعویٰ نہیں رکھتے تھے۔ آئمہ (ع) کا اختلاف بنی امیہ اور بنی عباس کے خلفاء کے ساتھ اسی امامت اور ولایت کے مسئلہ پر تھا، اسی معنی میں کہ جس میں ہم آج اسے استعمال کرتے ہیں۔

پہلا باب: پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم

پیغمبر اکرم (ص) کی اصل ذمہ داری حق اور حقیقت کی طرف دعوت اور اس کی راہ میں جہاد تھا۔ آپ کبھی بھی اپنے زمانے کی اندھیر نگری سے نہیں گھبر ائے۔ اُس وقت جب آپ مکہ میں تنہا یا صرف چند مسلمانوں کے ساتھ عرب کے متکبر سرداروں اور قریش کے مغرور اور قدرت مند سرداروں کے سامنے کھڑے تھے، آپ بالکل نہیں گھبر ائے؛ آپ نے حق کا پیغام پہنچایا

،اس کی بار بار تکرار کی، اسے روشن کیا، تمسخر کو برداشت کیا، سختیوں کو اور تکلیفوں کو اپنی جان پر جھیلا یہاں تک کہ آپ ایک بڑی تعداد کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہوگئے ۔نہ ہی اس وقت گھبرائے کہ جب آپ نے حکومتِ اسلامی تشکیل دینے کے بعد اس کی زمام اپنے ہاتھوں میں لی۔ اُس وقت بھی آپ کے رنگ رنگ کے دشمن موجود تھے؛ چاہے وہ عرب کے مسلح گروہ ہوں یعنی حجاز اور یمامہ کے بیابانوں میں ہر طرف پھیلے ہوئے وحشی یا پھر اُس زمانے کے بڑے بڑے بادشاہ یعنی اُس زمانے کی بڑی عالمی طاقتیں[1]؛ ایران اور روم۔ پیغمبر (ص) نے ان کو خطوط لکھے، ان سے بحث کی، اُن کے مقابلے میں لشکر کشی کی، اس راستے میں مشکلات اٹھائیں، اقتصادی پابندیوں سے دوچار ہوئے نوبت یہاں تک آئی کہ کبھی کبھی دو تین دنوں تک مدینے کے لوگوں کو کھانے کے لئے روٹی میسر نہیں آتی تھی۔ بے شمار خطروں نے ہر طرف سے آپ کو گھیرا ہوا تھا۔ اس صورتحال میں کچھ لوگ پریشان ہوتے تھے، کچھ کے ایمان متزلزل ہونے لگتے تھے، کچھ طنز کرنے لگتے تھے اور کچھ پیغمبر اکرم (ص) کو مصالحت کی طرف ترغیب دلانے لگتے تھے۔ لیکن اس دعوت و جہاد کے کار زار میں ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کے ارادوں اور اقدام میں کمی و کجی نہیں آئی، آپ نے پوری قدرت کے ساتھ اسلامی معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور اسے عزت اور قدرت کے اوج کمال تک پہنچا دیا، تب یہ معاشرہ اور نظام آپ کی استقامت کی برکت سے آئندہ چند سالوں میں دنیا کی پہلی بڑی طاقت میں تبدیل ہوگیا۔

---

[1] Super powers

بعثتِ پیمبر، بیداری کا آغاز

متواتر اور معروف حدیث کی بناپر خود پیغمبر اکرم(ص) نے ارشاد فرمایا ہے،"بعثت لِاُتَمِّمَ مکارِمَ الاخلاق "[1]۔ بعثت اس ہدف کے ساتھ وجود میں آئی ہے کہ اخلاقی کرامتیں اور روح بشر کی فضیلتیں عمومیت پیدا کریں اور کمال تک پہنچیں۔ جب تک کوئی شخص خود برترین مکارم اخلاق کا حامل نہیں ہو گا تب تک خدا اُسے یہ عظیم ذمہ داری ہرگز عطا نہیں فرمائے گا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند بعثت کے اوائل میں پیغمبر اکرم(ص) کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے،" انّک لَعلی خُلق عظیم "[2]۔ پیغمبر اکرم(ص) کی اپنی تیاری (تا کہ خدا انہیں اپنی وحی کے لئے مناسب خیال کرے)بعثت سے پہلے کے زمانے سے مربوط ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بعثت سے پہلے پیغمبر اکرم(ص) ایامِ جوانی میں ہی تجارت سے حاصل کی ہوئی کثیر دولت کو خدا کی راہ میں بطور صدقہ دے دیتے ہیں یا ساری دولت کو ضرورت مندوں اور ناچاروں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔اس زمانے میں جو پیامبر(ص) کے تکامل کا آخری زمانہ تھا،یعنی وحی کے نزول سے بالکل پہلے کا زمانہ، ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصہ میں پیغمبر اکرم(ص) کوہ حراء پر جاتے، اور آیات الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں، آسمان کا، ستاروں کا، زمین اور اس پر بسنے والے مختلف احساسات اور اطوار کے لوگوں کا مشاہدہ کرتے اور ان سب میں آیات الٰہی دیکھتے ہیں۔روز بروز

---

[1] صدرا، شرح اصول کافی، ج۱، ص ۴۲۰

[2] قلم / ۴،(اور آپ بلند ترین اخلاق کے درجے پر ہیں)

حق کے سامنے آپ کے خضوع میں اضافہ ہوتا ہے اور آپ کا دل ارادہ الٰہی اور اس کے امر و نہی کے آگے جھکتا چلا جاتا ہے۔ روز بروز آپ کے وجود میں جاری اخلاق کے چشموں کا بہاو تیز تر ہوتا جاتا ہے۔ روز بروز اخلاق کے نہال آپ کے وجود میں پنپتے ہیں۔ روایت میں موجود ہے، "کان اَعقل الناس و اکرَمَهُم"، آیات الٰہی کے مشاہدے کے ذریعے، پیغمبر اکرم (ص) بعثت سے پہلے روز بروز قوی و محکم ہوتے گئے یہاں تک کہ چالیس سال کی عمر تک پہنچ گئے ۔(فَلَمَّا استکمل اَربعین سنۃ و نَظَرَاللّٰہَ عزَّو جَلَّ اِلی قلبہ فَوَجَدَہ اَفضَلَ القلوبِ و اَجَلَّها و اَطوَعَها و اَخشَعَها و اَخضَعَها) چالیس سال میں پیامبر (ص) کا قلب، خاشع ترین، نورانی ترین اور پیام الٰہی کو دریافت کرنے کیلئے آمادہ قلب تھا۔(اَذِنِ لِاَبواب السماءِ فَفُتِحَت و مُحَمَّد یَنظَر اِلیها)[1] جب پیامبر اکرم (ص) روحانیت، معنویت اور نورانیت کی اس بلند چوٹی تک پہنچ گئے تو خداوندِ متعال نے آسمانوں کے اور غیب کے عالم کے دروازے اُن کے لیے کھول دیئے۔ ان کی آنکھوں کو معنوی اور غیبی عالموں سے آشنا کر دیا۔(و اُذِنَ للملائِکۃ فنزلوا و مُحَمَّد یَنظُرُ اِلیهم) پیغمبر (ص) فرشتوں کو دیکھتے تھے، اُن سے بات کرتے تھے، اُن کے کلام کو سنتے تھے یہاں تک کہ جبرئیل امین آپ پر نازل ہوئے اور 'اقراء' کے ساتھ بعثت کا آغاز ہو گیا۔

خدا کی اس بے نظیر مخلوق نے، اس انسان کامل نے جو وحی کے نزول سے پہلے ہی کمال کے اس درجہ تک پہنچ چکے تھے، بعثت کے آغاز کے ساتھ ہی ایک دشوار گذار جہاد کا آغاز کیا۔ ایسا جہاد جو ہمہ جہت تھا۔ ایک طرف یہ جہاد اُن لوگوں کے مقابلے میں تھا جو حقیقت کا کچھ بھی ادراک نہیں رکھتے تھے تو دوسری طرف اس کے مقابل اس زمانے کی مکمل تاریک فضا تھی۔ ایسی فضا

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۷، ص ۳۰۹

جس کے بارے میں امیر المومنین فرماتے ہیں،"فِی فِتَن داســـتم باخفافھا و وطئتھم باطلاقھا و قامت علی ســـنابکھا"[1]، ہر طرف سے فتنے لوگوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔ مثلاً دنیا طلبی، شہوت رانی، ظلم و ستم، اخلاقی رذائل اور قدرت مندوں کا بغیر کسی روک ٹوک کے کمزوروں پر ظلم و ستم، یہ قدرت مندوں کا ضعیفوں پر ظلم و ستم صرف مکہ یا جزیرہ عرب سے مخصوص نہیں تھا بلکہ اس زمانے کے دونوں بڑے تمدنی مراکز یعنی شہنشاہیت ایران اور روم بھی اسی کا شکار تھے۔ تاریخ کا مطالعہ کیجیے؛انسان کی پوری زندگی پر ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ بعثت کے ساتھ ہی پیغمبر (ص) کی جانب سے ایک ناقابل تصور بلاتوقف جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ مقابلے میں یہ تمام قدرتیں ہیں۔ اس دوران وحی الٰہی مسلسل پیغمبر (ص) کے قلب مقدس پر نازل ہوتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے شفاف پانی زرخیز زمین تک پہنچتا۔ یہ وحی، پیامبر (ص) کو قدرت عطا کرتی ہے اور آپ اپنی پوری قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا کو ایک عظیم تبدیلی سے ہم کنار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مکہ کے انہی دشوار گذار ایام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دست مبارک سے امت اسلامی کے اولین ڈھانچہ کی ڈاغ بیل ڈلی؛ یہ وہ ستون تھے جن پر امت اسلامی کی عمارت کو کھڑا ہونا تھا۔ سب سے پہلے ایمان لانے والے، وہ لوگ جو اتنی دانائی، اتنی شجاعت اور نورانیت رکھتے تھے کہ پیغمبر اکرم(ص) کے پیغام کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور اسے دل میں اتار لیں،(فَمن یُرِدِاللّٰہُ آن یھدیَہ یشرَح صَـدرَہ لِلاِسـلام)[2] معارف اور دستورات الٰہی کے لیے آمادہ دل، اسی

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲ (فتنے انہیں اپنے سموں سے روندتے اور اپنے کھروں سے کچلتے تھے اور اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑے ہوئے تھے)

[2] انعام / ۱۲۵ (پس خدا جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے)

زمانے میں پیغمبر (ص) کے ہاتھوں سے تیار ہوئے۔ اُن کی عقلوں نے رشد کیا اور ان کے ارادے روز بروز محکم ہوتے چلے گئے۔ اس دوران ان قلیل مومنین کو جن کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہوتا جارہا تھا، اتنی مشکلات اور سختیاں پیش آئیں کہ میرے اور آپ کے لئے قابل تصور بھی نہیں ہیں۔ اس ظلمت کدے میں جس کی ساری اقدار جاہلیت کی اقدار ہیں، جہاں تعصب، کینہ پروری، شقاوت، ظلم، شہوت، بے جا غیرت ایک دوسرے کے ساتھ متحد اور خلط ملط ہوکر لوگوں کو کچلے دے رہے ہیں، (اسلام کا ظہور ہوتا ہے) گویا سنگلاخ پتھروں کا سینہ چیر کر سرسبز پودا نکل آیا۔ (و اِنَّ الشجرة البَرّيّة اَصلَبُ عودا و اقوى وقودا)[1]۔ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ کلام اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ نہال، پتھروں میں پھوٹا، پتھروں میں ہی اس نے اپنی جڑیں پھیلائیں اور پھر رشد کرتا چلا گیا۔ کوئی طوفان اس کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔ اسی طرح تیرہ سال بیت گئے اور پھر انہیں مستحکم بنیادوں پر اسلامی اور نبوی، معاشرے کی عمارت کھڑی کی گئی۔ ایسا معاشرہ جو اس وقت کے عرب معاشروں کے برعکس ایک مہذب معاشرہ تھا۔

اسلامی نظام کا سنگِ بنیاد

امت کی تشکیل فقط سیاست تک محدود نہیں تھی: بلا استثناء سیاست اس کا ایک حصّہ ہے۔ اس کا ایک اور اہم حصّہ بھی تھا تمام افراد کی تربیت۔ (هُوالذی بعث فی الأُمیّین رسولا منهم یتلوا علیهم

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۵ (بیابان میں اگنے والے درخت کی لکڑی زیادہ مضبوط اور اس کی آگ زیادہ شعلہ ور ہوتی ہے)

آیاتہ و یزکّیھم و یعلّمھم الکتاب والحکمۃ)[1]۔(یزکّیھم) ہر ایک دل پیغمبر کے زیر تربیت تھا۔ ہر عقل کو، ہر ذہن کو پیغمبر علم و دانش کی تعلیم دیتے تھے۔(و یعلّمھم الکتاب و الحکمۃ)۔ حکمت، علم کتاب سے ایک درجہ بالاتر ہے۔ پیغمبر (ص) انہیں فقط قوانین و مقررات نہیں سکھاتے تھے بلکہ ان کی آنکھوں کو حقائق عالم کی طرف موڑتے تھے۔ دس سال تک پیغمبر (ص) اسی طریقہ سے آگے بڑھتے رہے۔ ایک طرف سیاست اور حکومت کی باگ ڈور، اسلام کی اشاعت، مدینہ سے باہر رہنے والے گروہوں میں بتدریج اسلام کی ترویج و تبلیغ کے لئے زمین ہموار کرنا اور دوسری طرف ایک ایک فرد کی تربیت۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

کچھ لوگ اسلام کو فقط ایک فردی دستور العمل جانتے تھے اور سیاست کو اس سے جدا کر دیتے تھے جبکہ پیغمبر اکرم(ص) نے مکّہ کی دشواریوں سے نجات پاتے ہی ہجرت کے بعد جو سب سے پہلا کام کیا تھا وہ سیاست تھا۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل، اسلامی حکومت کی تشکیل، اسلامی نظام اور فوج کی تشکیل، دنیا کے بڑے سیاست دانوں کو خطوط، دنیا کے سیاسی نقشے پر ظہور، یہ سب کچھ سیاست ہے۔ کس طرح اسلام کو سیاست سے جدا کیا جاسکتا ہے؟ سیاست کو کس طرح اسلام کی ہدایت کے بغیر کسی اور کی ہدایت میں سمجھا اور اجرا کیا جاسکتا ہے؟۔(الّذین جعلواالقرآن عضین)[2]؛ بعض لوگ قرآن کو جدا جدا کر دیتے ہیں۔(یومنُ بِبَعضِ الکتاب و یکفُر ببعض)[3]؛ اُس کی عبادت پر ایمان لے آتے ہیں لیکن اُس کی سیاست پر ایمان نہیں لاتے۔(لقد آرسلنا

---

[1] جمعہ / ۲ (اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو ان ہی میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے، ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے

[2] حجر /۹۱ (جن لوگوں نے قرآن کو ٹکڑے کر دیا ہے)

[3] تحف العقول، ص ۴۸۵ (کتاب کے بعض حصوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کر دیتے ہیں)

رســـلنا بالبیّنات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم النّاسُ بالقســـط)[1]؛ یہ قسط کیا ہے؟ قسط یعنی معاشرے میں اجتماعی عدالت کا قیام۔ یہ کام کون انجام دے سکتا ہے؟ معاشرے کی تشکیل ,عدالت اور قسط کے ساتھ، یہ ایک سیاسی کام ہے۔ جن کے ہاتھوں میں ملک کی عنان ہو وہ ہی یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ یہ ہے انبیاء کا ہدف۔ صرف ہمارے پیغمبر (ص) نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم اور باقی تمام انبیاء سیاست اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ پیغمبر اکرم(ص) کی مدینہ میں یہ دس سالہ حکومت بلا مبالغہ پوری تاریخ بشریت کی درخشاں ترین حکومت ہے۔ تاریخ بشریت کے اس مختصر لیکن کارآمد اور معجزاتی تاثیر رکھنے والے دور کو سمجھنا ضروری ہے۔ مدینہ کے دس سال پیغمبر اکرم(ص) کی 23 سالہ رسالت کا دوسرا باب ہے۔ مکّہ کے تیرہ سال اس کا پہلا باب تھا کہ جو دوسرے باب کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان دس سالوں میں پیغمبر اکرم(ص) نے اسلامی نظام کی داغ بیل ڈالی اور ہر مکان و زمان کے لئے اسلامی حاکمیت کا ایک ایسا کامل نمونہ پیش کیا کہ جس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ تمام مسلمانوں کو بلکہ تمام انسانوں کو چاہیے کہ اس نمونہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس کی خصوصیات کو سمجھیں اور پھر ان ہی بنیاد پر انسانوں اور نظاموں کے بارے میں فیصلہ کریں۔ مدینہ کی طرف ہجرت سے پیغمبر اکرم(ص) کا ہدف یہ تھا کہ سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی طور سے فاسد، پوری دنیا پہ چھائے ہوئے ظالمانہ اور طاغوتی ماحول کا مقابلہ کریں۔ ہدف فقط کفّار سے مقابلہ نہیں تھا بلکہ ہدف عالمگیر تھا۔ پیغمبر اکرم(ص) کی تحریک اس ہدف کے

---

[1] حدید / ۲۵ (بے شک ہم نے اپنے رسول کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا ہے تا کہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں)

تحت تھی اسی لیے آپ جہاں بھی زمین ہموار دیکھتے وہاں فکر و عقیدے کے بیج بوتے، اس امید پر کہ اپنے مناسب وقت پر یہ بیج، پودوں میں تبدیل ہو جائینگے۔ ہدف یہ تھا کہ آزادی، بیداری اور انسان کی سعادت کا پیغام ہر ایک دل تک پہنچے اور یہ کام ایک مکمل نمونہ پیش کئے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اسی لئے پیغمبر (ص) مدینہ تشریف لائے تاکہ اس خاکہ کو جسم دے سکیں۔ پیغمبر (ص) نے یہ نمونہ تمام تاریخِ بشریت کے سامنے پیش کر دیا۔ اب دوسرے کس حد تک اس کی پیروی کر سکتے ہیں، کس حد تک خود کو اس کے نزدیک کر سکتے ہیں یہ خود ان کی ہمت و صلاحیت پر منحصر ہے۔ پیغمبر (ص) کا یہ نظام مختلف خصوصیات کا حامل ہے لیکن سات خصوصیات سب سے زیادہ اہم اور نمایاں ہیں۔

پہلی خصوصیت ایمان اور معنویت ہے۔ نبوی نظام میں ترقی کا حقیقی عامل وہ ایمان ہے جو لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہے اور ان کے ہاتھوں، پیروں بلکہ پورے وجود کو صحیح سمت میں حرکت دیتا ہے۔ پس پہلی خصوصیت روحِ ایمان اور معنویت پھونکنا اور اس کی تقویت ہے، اور لوگوں کو صحیح اعتقاد اور نظریہ عطا کرنا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے اس کام کا آغاز مکہ سے کیا اور پھر مدینہ میں بھرپور قوت کے ساتھ اس کے عَلم کو سربلند کیا۔

دوسری خصوصیت قسط و عدل ہے۔ کام کی بنیاد قسط و عدل ہے اور ہر حال میں ہر صاحب حق کو اس کا حق پہنچانا ہے۔

تیسری خصوصیت علم اور معرفت ہے۔ نبوی نظام میں ہر چیز کی بنیاد علم، شناخت، آگاہی اور بیداری ہے۔ کسی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کو کسی سمت میں حرکت نہیں دی جاسکتی بلکہ

لوگوں کو آگاہی، معرفت اور تشخیص کی صلاحیت کے ساتھ فعال[1] عنصر میں تبدیل کیا جاتا ہے نہ کہ ایک منفعل[2] عنصر میں۔

چوتھی خصوصیت محبت اور اخوت ہے۔ نظام نبوی میں خرافات، ذاتیات اور منفعت طلبی کی بنیاد پر ابھرنے والے تمام جھگڑے اور تنازعات بے معنی ہیں اور ان سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ماحول پر محبت، اپنائیت، برادری اور ہم دلی کی فضا کا راج ہوتا ہے۔

پانچویں خصوصیت اخلاق اور کردار کی اصلاح ہے۔ یعنی انسانوں کو تزکیہ کے ذریعہ اخلاقی مفاسد اور رذائل سے پاک کیا جاتا ہے۔ با اخلاق اور پاک افراد پیدا کئے جاتے ہیں: (**یزکیھم و یعلمھم الکتاب و الحکمۃ**)[3] تزکیہ، نظام نبوی کا بنیادی عنصر اور اساس ہے۔ یعنی پیغمبر اکرم ﷺ نے ایک ایک فرد پر تربیتی کام کیا ہے، فرداً فرداً انسان سازی کی ہے۔

چھٹی خصوصیت اقتدار اور عزت ہے۔ نبوی معاشرہ اور نظام مغلوب، طفیلیہ، مقلد اور اِدھر اُدھر دست طلب دراز کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس کے بر عکس عزیز، قدرت مند اور فیصلوں میں مستقل ہے۔ اپنے فائدوں کو پہچانتا ہے اور اس کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھاتا ہے۔

ساتویں خصوصیت کام، تحریک اور دائمی ارتقاء و ترقی ہے۔ نظام نبوی میں توقف و جمود نہیں پایا جاتا۔ مسلسل تحریک، کام اور ارتقاء اس نظام کا حصہ ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کبھی کہا جائے کہ اب کام ختم ہو گیا، اب بیٹھ کر آرام کرتے ہیں! یہ چیز وجود نہیں ہی رکھتی۔ البتہ یہ کام لذت

---

[1] pro active

[2] reactionary

[3] آل عمران / ۱۶۴ (ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں)

بخش اور آرام دہ ہے۔ تھکا دینے والا، رنجیدہ خاطر کرنے والا اور افسردگی کا باعث، بامشقت کام نہیں ہے۔ ایسا کام ہے کہ انسان کو نشاط، قدرت اور شوق عطا کرتا ہے۔
پیغمبر اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تا کہ اس نظام کو قائم کریں، اس کو کامل کریں اور اس کو تاریخ کے لیے ابدی نمونہ کے طور پر محفوظ کر دیں تا کہ قیامت تک جو شخص بھی قدرت اور صلاحیت رکھتا ہو اس نمونہ کی پیروی کر کے نظام قائم کر سکے، دلوں میں شوق ایجاد کر سکے تا کہ لوگ ایسے معاشرے کی طرف متوجہ ہوں۔ البتہ اس طرح کے معاشرے کا قیام کئی ایک انسانی اور اعتقادی بنیادوں کا محتاج ہے۔ اول، صحیح عقیدہ اور صحیح افکار وجود رکھتے ہوں تا کہ ان افکار پر اس نظام کی بنیاد رکھی جا سکے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان افکار اور عقائد کو مکہ کے تیرہ سالوں میں توحید، عزت نفس اور دوسرے معارف کے قالب میں لوگوں کے لیے واضح کر دیا تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں بھی آپ نے دم بدم لوگوں کو ان بلند معارف کی جو اس نظام کی بنیاد ہیں، تعلیم دی اور لوگوں کے لیے انہیں واضح کیا۔ دوم، کیونکہ اسلامی نظام فردی اساس پر استوار نہیں ہے، اس لیے انسانی بنیادیں اور ستون لازم ہیں تا کہ یہ عمارت ان ستونوں پر کھڑی ہو سکے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان میں سے بہت سے ستونوں کو مکہ میں ہی تیار کر لیا تھا۔ البتہ پیغمبر کے پاس مرتبوں کے اختلاف کے ساتھ، صحابہ کرام کی کثیر تعداد موجود تھی جو مکہ کے سختیوں سے پُر تیرہ سالوں کی محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ایک جماعت وہ تھی جو یثرب میں پیغمبر کی ہجرت سے پہلے آپ کے پیغام کو سن کر وجود میں آئی تھی جیسے کہ سعد بن معاذ، ابو ایوب انصاری وغیرہ۔ بعد میں جب آپ مدینے میں تشریف لائے تو آپ نے داخل ہوتے ہی انسان سازی کا کام شروع کر دیا۔ اور روز بروز لائق مدیر، بلند مرتبہ، شجاع، بے لوث، باایمان

، قوی اور با معرفت انسان اس بلند اور شاندار عمارت کے ستونوں کی حیثیت سے مدینے میں پروان چڑھتے رہے۔

مدینہ[1] کی طرف پیغمبر کی ہجرت نسیم بہار کی مانند تھی کہ جو اس شہر کی فضا میں پھیلی اور سب نے محسوس کیا کہ جیسے ایک خوش آئند کشادہ فضا وجود میں آگئی ہے۔ اسی لیے دل بیدار اور متوجہ ہوئے۔ جب لوگوں نے سنا کہ پیغمبر قُبا میں وارد ہو گئے ہیں[2] تو روز بروز مدینہ والوں کے دلوں میں آپ کے دیدار کا شوق بڑھتا گیا۔ بعض افراد قُبا جاتے آپ کی زیارت کرتے اور واپس آ جاتے۔ بعض افراد مدینہ میں آپ کے منتظر تھے کہ آپ تشریف لائیں۔ بعد میں جب آپ مدینہ تشریف لائے تو آتشِ شوق اور یہ لطیف نسیم لوگوں کے دلوں میں ایک طوفان میں تبدیل ہو گئی جس نے دلوں کو بدل ڈالا۔ ناگہاں یہ احساس ہوا کہ (پرانے) عقائد اور جذبات، قبائلی تعصب اور وابستگیاں ان کے کردار، رفتار اور گفتار سے رخصت ہو گئیں اور وہ حقائقِ خلقتِ عالم اور اخلاقی معارف کی سمت کھلنے والے ایک نئے دریچے سے آشنا ہوئے ۔ یہی طوفان تھا جس نے سب سے پہلے دلوں میں انقلاب برپا کیا اور مدینہ کے اطراف میں پھیلا پھر مکہ کے قلعہ کو اس نے فتح کیا اور آخر کار دور دراز راہوں کی طرف گامزن ہوا یہاں تک کہ اس وقت کی دو بڑی مملکتوں اور سلطنتوں کے قلوب تک آ پہنچا۔ جہاں کہیں بھی گیا دلوں کو موہ لیا، انسانوں کے اندر انقلاب برپا کر دیا۔ صدر اول کے مسلمانوں نے ایران اور روم کو ایمان کی قوت سے فتح کیا۔ حملہ کا نشانہ بنے والی قومیں اور ملتیں جب کبھی ان کو دیکھتی تھیں تو صرف

---

[1] پیغمبر کی ہجرت سے قبل اس شہر کا نام یثرب تھا ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی پڑ گیا جو کثرت استعمال سے مدینہ رہ گیا ہے۔

[2] ، (قبا، مدینہ کے نزدیک ایک مقام ہے) آپ نے پندرہ دن وہاں قیام فرمایا۔

دیکھنے سے ہی ان کے دلوں میں بھی ایمان پیدا ہو جاتا تھا۔ شمشیر اس لیے تھی کہ رکاوٹوں اور حکومت و طاقت کے سرکردہ افراد کو راستے سے ہٹا سکے ورنہ عام لوگوں نے ہر جگہ اس طوفان کو پالیا تھا اور اس زمانے کی دو عظیم سلطنتیں یعنی روم اور ایران اپنی گہرائیوں تک اسلامی نظام اور مملکت کا جز بن گئیں۔ اس تمام کام میں صرف چالیس سال لگے؛ دس سال پیغمبر کے زمانے کے اور تیس سال پیغمبر کے بعد۔

پیغمبر جیسے ہی مدینے میں داخل ہوئے آپ نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ آپ کی زندگی کی حیرت انگیزیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان دس سالوں میں آپ نے ایک لحظہ بھی ضائع نہیں کیا۔ کبھی بھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ نور معنویت کو پھیلانے، ہدایت، تعلیم و تربیت کی ترویج سے ایک لمحے کے لیے بھی رکے ہوں۔ آپ کا جاگنا، آپ کا سونا، مسجد، گھر، میدان جنگ، کوچہ و بازار میں آنا جانا، گھریلو روابط، (غرض) آپ کا وجود، جس جگہ بھی تھا ایک درس تھا۔ عجیب برکت پائی جاتی ہے اس عمر میں۔ وہ جس کی فکر نے ساری تاریخ کو مسخر کر لیا اور اس پر اپنا اثر ڈالا، میں نے بارہا کہا ہے کہ بہت سارے ایسے مفاہیم جنہوں نے صدیوں بعد انسان کی نگاہوں میں تقدس پیدا کیا جیسے کہ مساوات، برادری، عدالت اور عوامی بالادستی وغیرہ یہ سب اسی تعلیم کا نتیجہ تھے۔ صرف دس سال حکومتی، سیاسی اور اجتماعی کام انجام دیئے تھے۔ کتنی با برکت عمر تھی۔ روز اول سے ہی آپ نے اپنے موقف کو واضح کر دیا تھا۔

وہ ناقہ کہ جس پر پیغمبر سوار تھے شہر یثرب میں داخل ہوا، لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس زمانے میں مدینہ مختلف محلوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر محلے کے اپنے بازار، گھر اور گلی کوچے ہوا کرتے اور اس کے گرد فصیل ہوا کرتی تھی۔ ہر محلہ ایک قبیلہ سے مخصوص ہوا کرتا تھا اور قبیلے کے بڑے افراد وہاں رہا کرتے تھے۔ بعض قبائل 'اوس' سے تعلق رکھتے تھے اور بعض ' خزرج'

سے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یثرب میں داخل ہوئے ، آپ جس قبیلے کے قلعے کے سامنے پہنچتے تھے اس قبیلے کے لوگ باہر آ کر آپ کے اونٹ کے گرد جمع ہو جاتے ۔ " یارسول اللہ! ہمارا گھر، ہماری زندگی، ہماری دولت، ہمارا سکون سب آپ کے اختیار میں۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جواب میں فرماتے اس اونٹ کا راستہ چھوڑ دو(إنها مامورة) یہ کسی کے حکم پر چل رہا ہے۔ اس کا راستہ نہ روکو۔ وہ اونٹ کے سامنے سے ہٹ جاتے۔ اونٹ چلتا چلتا دوسرے محلے تک پہنچتا۔ پھر اسی طرح اس محلے کے اشراف، صاحب شخصیت افراد، پیر و جوان سب آپ کے ناقہ کو گھیر لیتے، " یا رسول اللہ! یہاں اتریے، یہ آپ کا گھر ہے، جو کچھ آپ چاہیں گے آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے؛ ہم سب کے سب دل و جان سے آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔" پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے بھی یہ ہی فرماتے کہ میرے اونٹ کا راستہ مت روکو، " انہا مامورۃ"۔ اسی طرح آپ کا اونٹ محلوں محلوں گزرتا ہوا بنی نجار کے محلے تک پہنچا۔ آپ کی والدہ کا تعلق اسی گھرانے سے تھا، بنی نجار کے افراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماموں حساب کیے جاتے تھے؛ اسی لیے اس قبیلے کے لوگوں نے عرض کی، " یارسول اللہ! ہم آپ کے رشتہ دار ہیں، ہماری ہستی آپ کے اختیار میں ہے۔ ہمارے گھر میں قیام فرمایئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا، " نہیں، اس اونٹ کا راستہ چھوڑ دو ۔ یہ مامور ہے۔" اونٹ وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اونٹ مدینہ کے غریب ترین محلوں تک پہنچا اور ایک جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ سب لوگ دیکھنے لگے کہ یہ کس کا گھر ہے۔ دیکھا کہ ابو ایوب انصاری کا گھر ہے۔ مدینہ کے غریب ترین یا غریب ترین افراد میں سے ایک۔ خود ابو ایوب انصاری اور ان کے غریب گھر والے آئے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامان اٹھا کر اپنے گھر کے اندر لے گئے ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر میں داخل ہو گئے اور قبیلے کے اشراف، صاحب نفوذ اور صاحب حیثیت افراد کو رد کر دیا، یعنی اپنے اجتماعی مؤقف کو واضح کر

دیا کہ یہ شخص دولت، قبیلہ کی حیثیت، فلاں قبیلے کی ریاست، قوم اور قرابت داری، منہ زور افراد اور اس طرح کے دوسرے افراد سے ناتو وابستہ ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ پیغمبر ﷺ نے اسی وقت پہلے ہی لمحے واضح کر دیا کہ معاشرتی رفتار میں وہ کس گروہ اور جماعت کے طرف دار ہو نگے اور ان کا وجود کن لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو گا۔ سب پیغمبر کے وجود سے، ان کی تعلیمات سے نفع اٹھاتے تھے لیکن طبیعی طور پر جو جتنا زیادہ محروم تھا وہ اتنا زیادہ بہرہ مند ہوتا کیونکہ ضروری تھا کہ اس کی محرومیت کا ازالہ ہو۔

جناب ابو ایوب انصاری کے گھر کے سامنے خالی زمین تھی۔ فرمایا، "یہ کس کی زمین ہے؟" کہا کہ دو یتیم بچوں کی زمین ہے۔ آپ نے اپنی جیب سے پیسے ادا کر کے وہ زمین خرید لی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس زمین پر ہم مسجد بنائیں گے؛ یعنی ایک سیاسی، عبادی، اجتماعی اور حکومتی مرکز؛ یعنی لوگوں کے جمع ہونے کا مرکز۔ ایک مرکزی جگہ لازم تھی اسی لیے مسجد کی تعمیر شروع کر دی۔ مسجد کی زمین کسی سے طلب نہیں کی، کسی سے زمین بخشنے کی درخواست نہیں کی بلکہ زمین کو اپنے پیسوں سے خریدا۔ یہ دونوں بچے یتیم تھے ان کا کوئی مدافع نہیں تھا لیکن پیغمبر نے ایک باپ کی طرح ان کے حق کا دفاع کیا اور اس کی مکمل رعایت کی۔ جب مسجد بنا شروع ہوئی تو پیغمبر اکرم ﷺ پہل کرنے والوں میں سے ایک تھے آپ نے بنفس نفیس بیلچہ ہاتھ میں لے کر مسجد کے لیے کھدائی شروع کی۔ صرف نمائشی طور پر نہیں بلکہ واقعی زحمت سے کام شروع کیا۔ اس طرح سے کام کیا کہ جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ کہنے لگے کہ ہم بیٹھے رہیں اور پیغمبر اس طرح سے کام کریں؟ ہمیں بھی کام میں شریک ہونا چاہیے۔ وہ بھی کام میں شریک ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں مسجد تعمیر ہو گئی۔ پیغمبر نے ،اس عظیم اور قدرت مند رہبر نے اپنے اس عمل سے واضح کیا کہ وہ اپنے لیے کسی بھی اختصاصی حق کے قائل نہیں ہیں۔ اگر

مقرر ہے کہ کچھ کام انجام پائے تو اس میں ان کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اس نظام کے اصول وضع کئے۔ جب انسان دیکھتا ہے کہ یہ نظام کس طرح قدم بقدم آگے بڑھا ہے اور اس کے ہر قدم میں حکمت اور تدبیر دکھائی دیتی ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس کے پیچھے قوی اور محکم عزم وارادہ، فکر واندیشہ اور دقیق حساب کتاب موجود ہے جو بظاہر وحی الٰہی کے علاوہ ممکن نہیں ہے۔ اگر آج کوئی ان دس سالوں کے حالات وواقعات اور ماحول کو لحظہ بہ لحظہ سمجھنا چاہئے تو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ سب اتنی کم مدت میں کس طرح ہوا۔ اگر انسان ہر چیز کو جداگانہ حساب کرے تو کسی بھی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہو گا۔ لازم ہے کہ کاموں کی ترتیب کو دیکھے کہ کس طرح سب کام تدبر، عقلمندی اور حساب کتاب کے ساتھ صحیح طور پر انجام پائے ہیں۔

سب سے پہلے ایجاد وحدت ہے۔ مدینہ کے سب لوگ تو مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اکثریت مسلمان ہو گئی تھی لیکن ایک قلیل تعداد غیر مسلموں کی بھی تھی۔ اس کے علاوہ یہودیوں کے تین اہم قبیلے، بنو قینقاع، بنو نظیر اور بنو قریظہ بھی مدینہ میں ساکن تھے۔ یہ اپنے قلعوں میں رہتے تھے کہ جو تقریباً مدینہ سے جڑے ہوئے تھے۔ مدینہ میں ان کی آمد سو، دو سو سال قبل ہوئی تھی۔ وہ مدینہ کیوں آئے تھے یہ خود ایک مفصل اور طولانی داستان ہے۔ جب پیغمبر ﷺ مدینہ میں وارد ہوئے تو اس وقت دو تین چیزیں ان کی اہم خصوصیات تھیں۔ ایک یہ کہ مدینہ کی اصلی دولت ان کے اختیار میں تھی۔ کھیتی باڑی کی بہترین زمینیں، بہترین تجارت، سود بخش ترین صنعت مثلا سونا چاندی کے زیورات، یہ سب ان کے ہاتھ میں تھا۔ لوگ ضرورت کے وقت ان سے رجوع کرتے تھے ان سے قرض لیتے اور سود (ربا) ادا کرتے۔ یعنی مالی اعتبار سے پورا مدینہ ان کی گرفت میں تھا۔ دوسری چیز یہ کہ اپنی ثقافت کے اعتبار سے بھی یہ لوگ مدینہ والوں پر برتری رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ اہل کتاب تھے اس لیے مختلف دینی معارف اور

مسائل سے آگاہ تھے جو اہل مدینہ کے نیم وحشی ذہنوں سے بہت دور تھے۔ اسی لیے یہ لوگ مدینہ والوں پر فکری تسلط رکھتے تھے۔ اگر آج کی زبان میں گفتگو کریں تو یہودی مدینے میں روشن فکر طبقہ محسوب ہوتے تھے اور وہاں کے لوگوں کو احمق جانتے تھے، ان کی تحقیر کرتے اور مذاق اڑاتے۔ البتہ جب ضرورت ہوتی اور ان کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو چھوٹے بھی بن جاتے لیکن طبیعی طور پر یہ برتری کے حامل تھے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ دور دراز علاقوں سے ارتباط رکھتے تھے ،یعنی صرف مدینہ کی فضا میں محدود نہیں تھے۔ یہودی، مدینہ کی ایک حقیقت تھے، پیغمبر ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ پیغمبر اکرم نے ایک عمومی پیمان باندھا۔ جب آپ مدینہ میں داخل ہوئے تو بغیر اس کے کہ کوئی قرارداد ہوئی ہو یا لوگوں سے کوئی چیز طلب کی ہو یا لوگوں نے آپس میں اس موضوع پر گفتگو کی ہو مدینہ والوں پر یہ بات روشن تھی کہ اب اس مملکت کا سربراہ اور رہبر کون ہے یعنی نبوی عظمت اور شخصیت نے طبیعی طور پر سب کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ معلوم ہو گیا کہ وہ رہبر ہیں اور سب پر ان کی پیروی اور اطاعت لازم ہے۔ پیغمبر نے عہد نامہ لکھا جسے سب نے قبول کیا۔ یہ عہد نامہ باہمی تعاون اور اجتماعی میل جول، معاملات ،تنازع ،دیت اور مخالفین یعنی یہودی اور غیر مسلمین کے ساتھ پیغمبر کے روابط پر مشتمل تھا۔ یہ سب کچھ لکھا گیا اور محفوظ ہوا۔ کافی مفصل ہے شاید تاریخ کی قدیم کتابوں کے، جو حجم میں کافی بڑی ہوا کرتی تھیں، دو تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

دوسرا اہم قدم اخوت پیدا کرنا تھا۔ امیرانہ عزت، خرافات کی بنیاد پر تعصب، قبیلہ پر غرور اور فخر و مباہات، اس متعصب اور جاہل عرب معاشرے کے اہم ترین امراض تھے۔ پیغمبر نے اخوت ایجاد کر کے ان سب کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ فلاں قبیلے کے رئیس کو فلاں (اجتماعی

لحاظ سے [1]) پست یا متوسط شخص کے ساتھ اخوت کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ کہا کہ تم آپس میں بھائی ہو۔ انہوں نے پوری رغبت اور میل کے ساتھ اس برادری کو قبول کیا۔ اشراف اور بزرگان کو آزاد شدہ مسلمان غلاموں کے برابر قرار دیا اور اس کے ذریعے اجتماعی وحدت کے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا۔ جب مسجد کے لیے مؤذن انتخاب کرنے کا مرحلہ آیا تو اچھی آواز اور اچھی شکل وصورت کے بے شمار افراد موجود تھے۔ متعدد بڑی شخصیات موجود تھیں لیکن ان سب کے درمیان بلال حبشی کو منتخب فرمایا۔ شکل وصورت، آواز، خاندانی شرف ان میں سے کوئی بھی چیز معیار نہیں تھی۔ معیار تھا تو صرف اسلام و ایمان، خدا کی راہ میں جدوجہد اور فدا کاری۔ دیکھیے کس طرح اپنے عمل سے اقدار کو واضح کیا۔ اس سے پہلے کے ان کی بات دلوں پر اثر کرے ان کی سیرت اور ان کے عمل نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

اسلامی نظام کی حفاظت

اس کام کو نتیجے تک پہنچنے کے لیے تین مرحلہ درکار تھے۔ پہلا مرحلہ: اس نظام کی بنیاد ڈالنے کا تھا کہ جو درج بالا چیزوں کے ذریعے انجام پایا۔ دوسرا مرحلہ اس نظام کی حفاظت کا تھا۔ ایک زندہ موجود جو رشد اور نمو کی طرف گامزن ہو اس طرح کہ اگر اہل قدرت اسے پہچان لیں تو اس کے وجود سے خطرہ محسوس کریں، لازمی طور پر دشمن رکھتا ہے۔ اگر پیغمبر ﷺ دشمنوں کے مقابلے میں ہوشیاری کے ساتھ اس نظام کی حفاظت نہ کر سکیں تو یہ نظام مٹ جائے گا اور ساری زحمتیں ضائع ہو جائیں گی۔ تیسرا مرحلہ ہے اس بنیاد پر عمارت کی تعمیر کا۔ صرف بنیاد کافی

---

[1] social status

نہیں ہے بلکہ وہ تو پہلا قدم ہے۔ ان تینوں کاموں کو ایک ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچنا ہے۔ اسلامی نظام کی بنیاد ڈالنا پہلا قدم ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرحلہ کے دوران بھی دشمنوں کی طرف توجہ رہی ہے اور اس کے بعد بھی نظام کی حفاظت کے لئے دشمنوں پر کڑی نظر رکھی گئی۔ اس بنیاد کے رکھنے میں بھی لوگوں کی شخصیتوں اور معاشرے کی صورت حال کی طرف توجہ دی گئی ہے اور بعد میں بھی یہ توجہ برقرار رہی۔ پیغمبر ﷺ پر واضح ہے کہ اس نو مولود معاشرے کے پانچ دشمن ہیں کہ جو اس کی زندگی کے لیے خطرہ ہیں۔

ایک چھوٹا اور کم اہمیت دشمن ہے لیکن اس کے باوجود اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا جا سکتا کیونکہ ممکن ہے کسی وقت بڑا خطرہ بن جائے۔ وہ دشمن کون ہے؟ وہ مدینہ کے مضافات میں بسنے والے نیم وحشی قبائل ہیں۔ مدینہ سے چند فرسخ کے فاصلہ پر نیم وحشی قبائل آباد ہیں جن کی ساری زندگی جنگ، خون ریزی، غارت گری اور لوٹ مار سے عبارت ہے۔ اگر پیغمبر ﷺ چاہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک سالم اور پر امن معاشرہ وجود میں لائیں تو اس کے لیے ان کا حساب کتاب ضروری ہے۔ پیغمبر ﷺ نے ان کا حل یہ نکالا کہ ان میں سے جن کے اندر ہدایت اور اصلاح کا امکان تھا ان کے ساتھ پیمان باندھے اور معاہدے کیے۔ پہلے یہ نہیں کہا کہ ضروری ہے کہ مسلمان ہو جاو بلکہ انہی کافروں اور مشرکوں کے ساتھ معاہدے کیے تا کہ یہ نقصان نہ پہنچائیں۔ پیغمبر ﷺ اپنے عہد و پیمان پر سختی کے ساتھ پابند رہے، اس مطلب کو آگے عرض کروں گا۔ ان میں جو شریر اور غیر قابل اعتماد تھے پیغمبر ﷺ نے خود ان کا مقابلہ کیا۔ یہ جو آپ مختلف سریوں[1] کے بارے میں سنتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے پچاس لوگوں

[1] سریہ (غزوہ) کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے یعنی ایسی جنگ کہ جس میں پیغمبر شخصی طور پر جنگ میں موجود نہ ہوں

کو فلاں قبیلہ سے مقابلے کے لیے بھیجا، بیس لوگوں کو فلاں قبیلے سے، یہ سب ان ہی وحشی قبائل کے روابط سے مربوط ہے۔ ان لوگوں کی طبیعت میں اصلاح اور ہدایت نہیں تھی، ان کی سرشت میں خون ریزی شامل تھی اور وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے تھے اسی لیے پیغمبر ﷺ نے طاقت کے ذریعے ان کو زیر کیا اور ان کے فتنے کو خاموش کیا۔

دوسرا دشمن مکہ ہے کہ جو ایک مرکز ہے۔ صحیح ہے کہ مکہ میں باقاعدہ حکومت نہیں تھی لیکن متکبر، قدرت مند اور بااثر اشراف کا ایک گروہ مل کر مکہ پر حکومت کرتا تھا۔ ان میں آپس میں اختلافات تھے لیکن اس نومولود (اسلام) کے مقابلے میں یہ سب ایک تھے۔ پیغمبر ﷺ جانتے تھے کہ اصلی خطرہ ان کی طرف سے ہے اور عملی طور بھی ایسا ہی ہوا۔ پیغمبر ﷺ کو احساس تھا کہ اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ وہ خود مقابلے کے لیے آئیں تو یقیناً ان کو فرصت مل جائے گی۔ اسی لیے پیغمبر ﷺ خود ان کے مقابلے کے لیے نکلے البتہ مکہ کا رخ نہیں کیا۔ ان کے کاروانوں کا راستہ مدینہ کے نزدیک سے گزرتا تھا۔ پیغمبر ﷺ نے وہاں سے مقابلے کا آغاز کیا ۔ جنگ بدر اس سلسلے کی اہم ترین جنگ ہے۔ پیغمبر ﷺ نے کاروانوں کا راستہ روکا اور وہ بھی پورے تعصب اور ہٹ دھرمی کے ساتھ آپ کے مقابلے کے لیے آئے۔

ہجرت کے دوسرے سال میں خداوند بزرگ کی طرف سے مسلمانوں کو یہ خبر مل گئی تھی کہ وہ کافروں کے ایک گروہ پر کامیابی حاصل کریں گے۔ قریش کے سرداروں کے اموال کو اٹھائے ایک کاروان شام سے مدینہ کی طرف آرہا تھا تا کہ مدینہ کے کنارے سے ہوتے ہوئے مکہ تک پہنچ سکے۔ جب قریش کے کفار کو مسلمان دلاوروں کی طرف سے اس خطرہ کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنے مال کی حفاظت کے لیے ایک مسلح لشکر مدینے کی طرف روانہ کیا۔ مسلمان زیادہ اس

بات کی طرف مائل تھے کہ مال و متاع کے حامل تجارتی کاروان جس کے ساتھ خاص محافظ بھی نہیں ہیں اس کا راستہ روکیں لیکن خدا کا حکم یہ تھا کہ قریش کے کافروں کے مسلح لشکر کا مقابلہ کیا جائے۔(وَاِذیَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحدَی الطَّآئِفَتَینِ اَنَّہَالَکُم وَتَوَدُّونَ اَنَّ غَیرَ ذَاتِ الشَّوکَۃِ تَکُونُ لَکُم) [1] ۔ مسلمان جانتے تھے کہ اس معرکہ میں کامیاب ہونگے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کامیابی قریش کے مسلح لشکر کے مقابلے میں ہے یا شام سے پلٹنے والے ان غلاموں اور کاروان کے مامورین پر۔ لیکن پیغمبر ﷺ نے ان کے راستے کو موڑ دیا اور ان کو قریش کے لشکر کے مقابلے کے لیے لے گئے اور کاروان چلا گیا۔ بدر نامی مقام پر مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہوا۔ کیا وجہ تھی کہ خدا نے اہل کاروان سے لڑنے کے بجائے مسلمانوں کی راہ کو مسلح لشکر کی طرف موڑ دیا۔ اس کی علت یہ تھی کہ مسلمان صرف قریب کو دیکھ رہے تھے جبکہ مشیت الٰہی ایک بلند ہدف کے تعاقب میں تھی۔(وَیُرِیدُ اللّٰہُ اَن یُّحِقَّ الحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ) [2] خدا یہ چاہتا ہے کہ حق چہرہ پوری دنیا پر ظاہر ہو۔ (لِیُحِقَّ الحَقَّ وَیُبطِلَ البَاطِلَ وَلَوکَرِہَ المُجرِمُونَ) [3] خدا چاہتا ہے کہ باطل زائل ہو جائے جس کی طبیعت میں ہی زوال پذیری ہے۔ ایک ہی مرتبہ اس کی بساط اٹھا دی جائے۔ کیا قرار نہیں ہے کہ اسلام تمام طاغوتی اور شیطانی قدرتوں کو سر نگوں کر دے اور ان کے تسلط کو ختم کر دے ؟ کیا یہ طے نہیں ہے کہ مسلمان امت (لِتَکُونُوا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ) [4] ہو،

---

[1] انفال / ۷،(اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمہارے لئے بہر حال ہے اور تم چاہتے تھے کہ وہ طاقت والا گروہ نہ ہو)

[2] انفال /۷، (اور اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کو ثابت کرنا چاہتا ہے)

[3] انفال /۸ ،(تا کہ حق ثابت ہو جائے اور باطل فنا ہو جائے چاہے مجرمین اسے کسی قدر برا کیوں نہ سمجھیں)

[4] بقرہ /۱۴۳،(تا کہ (دنیا کے) لوگوں پر گواہ ہو)

کیا یہ طے نہیں ہے کہ اسلام کا پرچم انسانی اور بشری بلندی کی انتہا پر لہرایا جائے؟ پھر کب؟ کس طرح اور کس راہ سے؟

اس وقت کے مسلمان آپس میں یہ سوچ رہے تھے کہ اگر وہ اس ثروت مند کاروان کو اپنے قبضے میں کر لیں تو اس تازہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے والے اسلام کو قوت مل جائے گی اور وہ صحیح سوچ رہے تھے لیکن اس سے زیادہ بلند اور قیمتی ایک اور فکر بھی تھی۔ وہ بلند فکر یہ ہے کہ آج ہم، پیغمبر صَلَّىٰ اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے گرد جمع مسلمان، آج ہم اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ ہم اپنی فکر اور اپنی راہ کو مستضعف اور محروم معاشروں اور ظلمت اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی دنیا میں نافذ کر سکتے ہیں، اس ظرف میں اتنا پانی موجود ہے کہ یہ خود بہہ کر اس خشک اور خار دار زمین اور ان درختوں اور ننھے پودوں تک پہنچے۔ یہ ہے بالاترین فکر۔ اگر طے یہ ہے کہ اسلام اپنی حقیقی کامیابی تک پہنچے، اگر فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کا باوقار و باعظمت نظام کمزوروں اور حرمان نصیبوں کے علاقوں تک پہنچے اور ظلم و ستم کے قلعے ایک ایک کر کے اس کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے جائیں تو یہ ضروری ہے کہ کسی جگہ سے تو اس کام کا آغاز ہو۔ صدر اسلام کے بااخلاص مسلمان نہیں جانتے تھے کہ کہاں سے آغاز کریں، یہ خدا ان کو سکھاتا ہے ،یہ مواقع ان کے لیے فراہم کرتا ہے اور اس لشکر کو کہ جو صرف قریش کے مال پر قبضے کے لیے باہر نکلا تھا ایک ایسی جنگ کہ طرف موڑ دیتا ہے جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ کیوں؟ تا کہ اس ناخواستہ جنگ میں جنگی ساز و سامان کی کمی لیکن قاطع ایمان کے ساتھ مسلمان صرف ایک دن میں دشمن کو پیچھے دھکیل دیں اور اسلام کی پیشرفت اور اس کے نفوذ کی راہیں کھل جائیں۔ حق کی حاکمیت کا راستہ کھل کر واضح ہو جائے اور دشمن سمجھ جائے کہ اسلام مذاق نہیں ہے۔ (لیحق الحق ویبطل الباطل) اے مسلمانوں ہم نے تمھارے نہ چاہتے ہوئے تمھیں دشمن کے کثیر لشکر کے

سامنے کھڑا کر دیا تا کہ اپنے ہاتھوں کی ضرب کا مزہ انہیں چکھاؤں اور قدرت الٰہی کا نمونہ ان کے سامنے لاؤ۔

جنگ بدر میں خدا کی رحمت و فضل اور مسلمانوں کی ہمت و الٰہی نصرت سے مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوئی لیکن دشمن اتنی جلدی اپنی دشمنی سے دست بردار ہونے والا نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے جنگ احد میں اس شکست کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ اس جنگ میں بھی شروع میں مسلمانوں نے اپنے اتحاد اور اتفاق کی وجہ سے دشمنوں کو شکست دے دی۔ اس فوری کامیابی کے بعد وہ پچاس لوگ کہ جو پہاڑی درے کی حفاظت پر مامور تھے اس خوف سے کہ کہیں مال غنیمت جمع کرنے میں پیچھے نہ رہ جائیں اپنی ذمہ داری کو بھول کر غنائم جمع کرنے کے عمل میں شامل ہو گئے۔ صرف دس سپاہی اپنی جگہ پر قائم رہے اور اپنی ذمہ داری کو ادا کرتے رہے۔ دشمنوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ پہاڑی کے پیچھے سے گھوم کر اس درے سے جس پر اب کافی محافظ نہیں تھے مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ یہ حملہ مسلمانوں کے لیے بہت گراں ثابت ہوا، اسلام کو شکست نہیں ہوئی لیکن اسلام کی کامیابی میں تاخیر ہوئی اور سید الشہداء حضرت حمزہ جیسے شجاع اور عزیز سردار کو اس راہ میں قربان ہونا پڑا۔ خدا مسلمانوں کو عبرت اور غور و فکر کی طرف دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے اپنے وعدے پر عمل کیا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ تم دشمنوں پر غالب آو گے اور تم غالب ہو گئے تھے لیکن جب یہ تین خصوصیتیں اور خصلتیں تمھارے اندر آئیں تو تمھیں ان کا نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ تین خصوصیتیں عبارت ہیں: پہلی صفت (تنازعتم فی الامر) آپس میں اختلاف کرنے لگے اور تم نے اپنی صفوں کی وحدت اور وحدت کلمہ کو خراب کیا، دوسری صفت (فشلتم) سست ہو گئے، تم نے اپنے اس پہلے والے جذبہ اور

ہمت کو کھو دیا۔ تیسری صفت (عصیتم)[1] تم نے اپنے پیغمبر ﷺ اور رہبر جو تمھارے امور کے ذمہ دار ہیں ان کے حکم سے سر تابی کی۔ جب یہ تین صفتیں تمھارے اندر پیدا ہوئیں تو دشمن کو یہ موقع مل گیا اور وہ پشت سے تم پر حملہ آور ہوا جس کے نتیجے میں اسلام کے عزیز ترین فرزند خاک وخون میں نہا کر شہادت کے افتخار تک پہنچے اور عالم اسلام کو ان کو کھو دینے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

آخری اہم جنگ جس میں کفار پیغمبر ﷺ کی طرف آئے، جنگ خندق تھی ۔ کفار نے اپنی تمام تر قوت کو جمع کیا اور دوسروں سے بھی مدد لی۔ ان کا ارادہ تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو اور ان کے دو چار سو قریبی ساتھیوں کو قتل کر کے مدینہ کو بھی تاراج کریں گے۔ اس کے بعد مسلمانوں کا کوئی نام و نشان نہیں بچے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ مدینہ پہنچیں، پیغمبر ﷺ حالات سے آگاہ ہو گئے اور آپ نے خندق کھدوائی۔ مدینہ میں صرف ایک جگہ سے داخل ہوا جا سکتا تھا اس لیے اس جگہ تقریبا چالیس میٹر کی خندق کھودی تھی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ بعض روایات کے مطابق موسم بہت سرد تھا۔ اس سال بارش بھی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو کوئی در آمد بھی نہ تھی۔ غرض یہ کہ مشکلات زیادہ تھیں۔ ان سخت حالات میں خندق کی کھدائی میں خود پیغمبر ﷺ نے حصہ لیا۔ خندق کھودنے کے درواران جب کوئی شخص تھک جاتا اور کام نہیں کر پاتا تو پیغمبر ﷺ اس کے ہاتھ سے کھدال لیکر اس کی جگہ کام کرنے لگتے۔ پیغمبر نے صرف حکم نہیں دیا بلکہ بنفس نفیس لوگوں کے ہمراہ اور ان کے درمیان موجود رہے۔ کفار، خندق کے کنارے پہنچے، انہوں نے دیکھا کہ وہ اس کو پار نہیں کر سکتے لہٰذا

[1] آل عمران/ ۱۵۲،(۔۔تم نے کمزوری کا مظاہرا کیا اور آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور خدا کی نافرمانی کی۔۔)

شکستہ، مایوس اور ناکام واپس لوٹ گئے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ قریش کا ہم پر یہ آخری حملہ تھا اس کے بعد ہماری باری ہے، اب ہم مکہ کی طرف ان کے پیچھے جائینگے۔

اس کے ایک سال بعد پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ ہم عمرے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ صلح حدیبیہ کا واقع اس زمانے میں پیش آیا یہ بہت ہی پر مغز اور عمیق واقعہ ہے۔ پیغمبر ﷺ نے عمرے کے قصد سے مکہ کی طرف سفر کیا۔ کفار نے دیکھا کہ ماہ حرام میں جو جنگ کا مہینہ نہیں ہے اور وہ بھی اس کا احترام کرتے تھے، پیغمبر ﷺ مکہ کی طرف آرہے ہیں۔ کیا کریں؟ ان کا راستہ کھلا چھوڑ دیں اور آنے دیں؟ اس کامیابی کے بعد وہ کس طرح پیغمبر ﷺ کا مقابلہ کر پائیں گے؟ کیا ماہ حرام میں ان کے ساتھ جنگ کریں؟ کس طرح جنگ کریں؟ آخر کار انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پیغمبر ﷺ کو مکہ نہیں آنے دیں گے اور اگر موقع مل گیا تو ان کا قتل عام کر دیں گے۔ پیغمبر ﷺ نے اپنی عالی ترین تدبیر کے ساتھ ایسا کام کیا کہ ان کو قرارداد کرنا پڑی تا کہ پیغمبر ﷺ واپس چلے جائیں، لیکن اگلے سال آئیں اور عمرہ بجالائیں اور اس کے ساتھ پورے علاقہ میں تبلیغ کا راستہ بھی پیغمبر ﷺ کے لیے کھل گیا۔ اس کو صلح سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر خداوندِ متعال قرآن میں اس کو فتح مبین کے نام سے یاد کرتا ہے: (انافتحنا لک فتحا مبنیاً) [1] ہم نے تمھارے لیے فتح مبین کھول دی۔ اگر کوئی تاریخ کے صحیح اور محکم منابع کی طرف رجوع کرے تو دیکھے گا کہ حدیبیہ کا ماجرا کس قدر عجیب ہے۔ اس صلح کے اگلے سال پیغمبر ﷺ عمرہ کے لیے گئے اور کفار کی خواہش کے بر عکس اس عظیم ہستی کی عظمت و شوکت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ہجرت کے آٹھویں سال جب کفار اپنے عہد پر باقی نہ رہے تو پیغمبر

[1] فتح/ا، (ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی)

ﷺ نے جا کر مکہ کو فتح کر لیا۔ ایسی عظیم فتح جو پیمبر کے تسلط اور اقتدار کی عکاس ہے۔ اس بنیاد پر پیغمبر ﷺ نے اس دشمن کے ساتھ بھی تدبیر، قدرت، صبر و حوصلہ کے ساتھ، بغیر گھبرائے اور حتیٰ ایک قدم پیچھے ہٹے بغیر مقابلہ کیا اور روز بروز، لحظہ بہ لحظہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔

تیسرا دشمن یہودی تھے یعنی وہ غیر قابل بھروسہ اجنبی جنہوں نے وقتی طور پر تو پیغمبر ﷺ کے ساتھ مدینہ میں زندگی گزارنا قبول کر لیا تھا لیکن پیمبر کو تکلیف دینے اور اسلامی معاشرے اور حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ سورہ بقرہ کا اچھا خاصہ حصہ اور بعض دوسری سورتیں پیغمبر ﷺ کے یہودیوں کے ساتھ معاملات اور ان کے ساتھ ثقافتی جنگ سے مربوط ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ اہل ثقافت تھے اس لیے یہ آگاہی رکھتے تھے اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کے ذہنوں پر بہت زیادہ اثر ڈالتے تھے۔ یہ سازشیں کرتے تھے، لوگوں کو ناامید کرتے تھے اور ایک دوسرے کی جان کا دشمن بنا دیتے تھے۔ یہ پیغمبر ﷺ کے مضبوط، ترقی یافتہ اور منظم دشمن تھے۔ جہاں تک ہو سکا پیغمبر ﷺ نے ان کے ساتھ صبر و تحمل سے کام لیا لیکن جب دیکھا کہ یہ باز آنے والے نہیں ہیں تو ان کو سزا دی۔ پیغمبر ﷺ بلا وجہ، بغیر کسی مقدمہ کے ان کی طرف نہیں گئے تھے بلکہ ان تینوں قبیلوں میں سے ہر ایک نے ایسا عمل انجام دیا تھا کہ جس کی بنیاد پر پیغمبر ﷺ نے ان کو سزا دی۔ سب سے پہلے بنی قینقاع تھے جنہوں نے پیغمبر ﷺ کے ساتھ خیانت کی۔ پیغمبر ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ مدینہ سے چلے جائیں۔ ان کو اس جگہ سے باہر کر دیا اور ان کے سارے وسائل مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔

دوسرا قبیلہ بنی نضیر تھا۔ انہوں نے بھی خیانت کی ان کی خیانت کی داستان مبہم ہے، لہٰذا پیغمبر ﷺ نے ان کو حکم دیا وہ اپنا کچھ ساز و سامان اپنے ہمراہ لے کر مدینہ کو ترک کر دیں، وہ مجبور ہو گئے اور انہیں مدینہ چھوڑنا پڑا۔

تیسرا قبیلہ بنی قریظہ تھا کہ جن کو پیغمبر ﷺ نے امان دی اور اجازت دی کہ وہ مدینہ میں باقی رہیں۔ پیغمبر ﷺ نے ان کے ساتھ پیمان باندھا کہ وہ جنگ خندق میں اپنے علاقوں کی طرف سے دشمن کو مدینہ میں نہیں آنے دیں گے۔ لیکن انہوں نے دھوکہ دیا اور دشمن کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر پیغمبر ﷺ پر حملہ کریں گے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ پیغمبر ﷺ کے ساتھ کیے ہوئے پیمان کے پابند نہیں رہے بلکہ دشمن کے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ ان کے علاقے سے دشمن مدینہ میں داخل ہو گا اور وہ دونوں مل کر پشت سے پیغمبر ﷺ پر حملہ کریں گے۔ مدینہ میں داخلہ کے دو راستے تھے ایک جگہ پر خندق کھودی گئی تھی اور دوسرا راستہ بنی قریظہ کے علاقہ سے مدینہ میں داخل ہونے کا تھا، جہاں سے دشمن کو داخل ہونے سے روکنا ان کی ذمہ داری تھی۔ اس جگہ کے بارے میں انہوں نے دشمن سے یہ ساز باز کر لی۔

پیغمبر ﷺ اس سازش سے باخبر ہو گئے۔ مدینہ کا محاصرہ تقریباً ایک مہینہ تک چلا؛ اس مہینے کے وسط میں انہوں نے یہ خیانت کی۔ پیغمبر ﷺ کو خبر ہو گئی کہ انہوں نے یہ ارادہ کیا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے نہایت عقلمندی کے ساتھ ایسی تدبیر کی کہ ان کا اور قریش کا رابطہ خراب ہو گیا کہ جس کا سارا ماجرا تاریخ میں نقل ہوا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے ایسا حربہ استعمال کیا کہ ان کا اور قریش کا یک دوسرے پر سے اعتماد ختم ہو گیا۔ یہاں پر پیغمبر ﷺ کی ایک بہت ہی خوبصورت جنگی و سیاسی تدبیر نظر آتی ہے۔ پیغمبر ﷺ نے وقتی طور پر انہیں روک دیا کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ بعد میں جب قریش اور ان کے ہم پیمان شکست کھا کر خندق سے ہٹ گئے اور مکہ

واپس چلے گئے تو پیغمبر ﷺ مدینہ لوٹ آئے۔ جس دن پیغمبر ﷺ واپس آئے ہیں اسی دن انہوں نے نماز ظہر ادا کی اور کہا کہ نماز عصر بنی قریظہ کے قلعوں کے سامنے پڑھیں گے، کوچ کرو کہ وہاں چلیں۔ یعنی ایک رات کی بھی تاخیر نہیں کی۔ پیغمبر ﷺ نے ان قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ ۲۵ دن تک یہ محاصرہ اور لڑائی چلی جس کے بعد پیغمبر ﷺ نے ان کے وہ تمام مرد جو جنگ کی صلاحیت رکھتے تھے، کو موت کی سزا دی کیونکہ ان کی خیانت بہت بڑی تھی اور وہ اصلاح کے قابل نہیں تھے لہذا پیغمبر ﷺ ان کے ساتھ اس طرح پیش آئے۔ پیغمبر ﷺ نے یہودیوں کی دشمنیوں کو، بنی قریظہ کے واقعہ میں، اس سے پہلے بنی نظیر و بنی قینقاع کے ساتھ اور اس کے بعد خیبر کے یہودیوں کے سلسلے میں، اپنی تدبیر، قدرت، بغیر کسی تاخیر کے اور اعلیٰ انسانی اخلاق کے ساتھ مسلمانوں سے دور کر دیا۔ ان میں سے کسی بھی واقعہ میں پیغمبر ﷺ نے اپنے عہد کو نہیں توڑا۔ اسلام کے دشمن بھی اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے ان میں سے کسی بھی واقعہ میں عہد شکنی نہیں کی بلکہ یہودی اپنے عہد پر باقی نہیں رہے۔

چوتھے دشمن منافق تھے۔ یہ مسلمانوں کے درمیان زندگی گذار رہے تھے اور ان کے ساتھ ملے جلے ہوئے تھے، یہ وہ لوگ تھے کہ جو زبان سے ایمان لے آئے تھے لیکن ان کے باطن ایمان سے خالی تھے؛ پست، اہل عناد، تنگ نظر، دشمن کا ساتھ دینے پر آمادہ لیکن غیر منظم۔ ان میں اور یہودیوں میں یہی فرق تھا۔ پیغمبر ﷺ، منظم دشمن سے جو حملہ کرنے اور نقصان پہنچانے کے لیے تیار بیٹھا ہوتا تھا اس طریقہ سے پیش آتے جس طرح آپ یہودیوں کے ساتھ پیش آئے اور ان کو امان نہیں دیتے۔ لیکن ایسا دشمن جو غیر منظم ہو اور شخصی طور پر دشمنی، خباثت اور ہٹ دھرمی رکھتا ہو اور ایمان سے عاری ہو، پیغمبر ﷺ اس کو تحمل کرتے۔ عبد اللہ بن ابی، پیغمبر ﷺ کے سخت ترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ یہ شخص تقریباً پیغمبر ﷺ

کی زندگی کے آخری سال تک زندہ تھا لیکن پیغمبر ﷺ نے کبھی بھی اس کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔ باوجود اس کے کہ سب جانتے تھے کہ وہ منافق ہے پیغمبر ﷺ نے اس کے ساتھ میل جول رکھا، اس کے ساتھ دوسرے مسلمانوں جیسا سلوک کیا، اس کی جان و آبرو کی حفاظت کی، اس کے باوجود کہ یہ منافقین بدکاریاں اور خباثتیں کرتے رہتے تھے پیغمبرِ گرامی قدر ﷺ نے ان کو امان دی۔ سورہ بقرہ میں ایک حصہ ان منافقین سے مربوط ہے۔ لیکن جب منافقین کے ایک گروہ نے منظم کاروائی شروع کی تو پھر پیغمبر ﷺ نے بھی ان کو آزاد نہیں چھوڑا۔ مسجد ضرار کے واقعہ میں انہوں نے ایک مرکز بنایا کہ جو نظام اسلامی کا حصہ نہیں تھا۔ ان منافقین نے رومیوں مثلاً ابو عامر راہب جیسے لوگوں سے رابطہ قائم کیا اور روم کی جانب سے پیغمبر ﷺ کے خلاف لشکر کشی کے لئے راہیں ہموار کیں۔ یہاں پیغمبر ﷺ ان کے پیچھے گئے اور جو مسجد انہوں نے بنائی تھی اس کو توڑ کر جلا دیا۔ فرمایا یہ مسجد، مسجد نہیں ہے بلکہ، خدا اور لوگوں کے خلاف سازش کی جگہ ہے۔ ان ہی منافقین میں سے ایک گروہ جب مدینہ جا کر پیغمبر اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے لگا اور لشکر کشی کے منصوبے بنانے لگا تو پیغمبر ﷺ نے ان سے مقابلہ کیا اور فرمایا کہ اگر یہ نزدیک آئیں گے تو ہم جا کر ان سے جنگ کریں گے۔ مدینہ کے اندر بھی منافقین تھے لیکن پیغمبر ﷺ ان کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ پس بنا بر این ،تیسرے گروہ کے ساتھ پیغمبر ﷺ کا سلوک منظم اور قاطع تھا لیکن چوتھے گروہ کے ساتھ ہمیشہ نرمی کا رویہ رکھتے تھے کیونکہ یہ منظم نہیں تھے اور ان کا خطرہ فردی خطرہ تھا۔ پیغمبر ﷺ غالباً اپنے سلوک سے ان کو شرمندہ کرتے رہتے تھے۔

پانچواں دشمن وہ دشمن تھا کہ جو ہر ایک مسلمان اور مومن کے اندر موجود تھا۔ سب سے زیادہ خطرناک یہی دشمن ہے۔ یہ دشمن ہمارے اندر بھی موجود ہے؛ نفسانی خواہشات، خود خواہی،

انحراف اور گمراہی کی طرف رجحان اور وہ لغزشیں جن کے مقدمات خود انسان فراہم کرتا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے اس دشمن کا بھی سختی سے مقابلہ کیا البتہ اس دشمن کا مقابلہ شمشیر سے نہیں ، بلکہ اس کا مقابلہ تربیت و تزکیہ و تعلیم و آگہی سے کیا۔ اسی لیے جب لوگ انتہائی زحمتیں اٹھا کر جنگ سے واپس آئے تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ تم چھوٹے جہاد سے لوٹ آئے ہو اب بڑے جہاد میں مشغول ہو جاؤ۔ (لوگوں نے کہا) یارسول اللہ! حیرت ہے، اس سے بڑا کونسا جہاد ہے ؟ہم نے اتنی زحمتوں کے ساتھ اتنا عظیم جہاد کیا ہے، کیا اس سے بڑا کوئی جہاد موجود ہے ؟ فرمایا ہاں، اپنے نفس کے ساتھ جہاد۔ قرآن کہتا ہے: (الذین فی قلوبھم مرض)[1] یہ منافقین نہیں ہیں بلکہ منافقین کا ایک گروہ (الذین فی قلوبھم مرض) ایک حصہ ہے، لیکن ہر کوئی جو (الذین فی قلوبھم مرض) کا مصداق ہے یعنی دل میں بیماری رکھتا ہے وہ منافقین کا جزو نہیں ہے؛ ہو سکتا ہے کہ مومن ہو لیکن اس کے دل میں مرض ہے۔ مرض یعنی کیا؟ مرض یعنی شخصیت کا ضعف، اخلاقی ضعف، ہوا و ہوس، خود خواہی کی مختلف اقسام اگر ان سب کا راستہ نہیں روکا اور ان کا مقابلہ نہیں کیا تو یہ ایمان کو تم سے لیکر تمہیں اندر سے کھوکھلا کر دیں گی۔ جب ایمان چلا گیا تو تو تمہارا دل ایمان سے خالی اور ظاہر باایمان ہے، اس وقت ایسے شخص کا نام منافق ہے۔

اگر خدانخواستہ میرا اور آپ کا دل ایمان سے خالی ہو گیا اس حال میں کہ ہمارا ظاہر ایمانی ہے۔ ایمان اور اعتقاد کے تقاضے اور ان سے دلی وابستگی ختم ہو گئی لیکن ہماری زبان اسی طرح ایمانی باتیں کرتی رہی جس طرح پہلے کرتی تھی تو یہ نفاق ہو گا اور یہ خطرناک ہے۔ قرآن کہتا ہے:(

---

[1] توبہ / ۱۲۵،(۔۔۔اور جن کے دلوں میں مرض ہے)

ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِینَ اَسَآءُوا السُّوأیٰ اَن کَذَّبُوا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوا بِھَا یَستَھزِءُونَ)[1] وہ لوگ جنہوں نے برا کام انجام دیا تو ان کا نصیب بدترین ہوگا۔ وہ بدترین کیا ہے؟ آیات الٰہی کی تکذیب۔ ایک اور جگہ پر فرماتا ہے: وہ لوگ کہ جو اس اہم ذمہ داری، یعنی خدا کی راہ میں انفاق، پر عمل نہیں کرتے، (فَاَعقَبَھُم نِفَاقًا فِی قُلُوبِھِم اِلٰی یَومِ یَلقَونَہٗ بِمَا اَخلَفُوا اللّٰہَ مَا وَعَدُوہُ وَبِمَا کَانُوا یَکذِبُونَ)[2] کیونکہ انہوں نے خدا سے کئے ہوئے وعدے کو توڑ دیا اس لیے ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہو گیا۔ یہ اسلامی معاشرے کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ تاریخ میں جہاں کہیں ہمیں اسلامی معاشرہ میں انحراف نظر آتا ہے وہ اسی نفاق کے ذریعہ آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بیرونی دشمن آئے اور آ کر قتل و غارت کرے سخت شکست سے دوچار کر دے لیکن وہ اسلام کو نابود نہیں کر سکتا۔ بالآخر ایمان باقی رہتا ہے جو پھر سے سر ابھارتا ہے اور اسلام کا پودا پھر سے سرسبز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ اندرونی دشمن حملہ کرے اور انسان کو اندر سے خالی کر دے تو لازمی طور پر کجروی پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاں بھی انحراف پایا جاتا ہے اس کی جڑ یہی دل کی بیماری ہے۔ پیغمبر ﷺ نے اس دشمن کے ساتھ بھی مقابلہ کیا۔ پیغمبر ﷺ نے اپنی رفتار میں تدبیر اور سرعت کے ساتھ عمل کیا۔ کسی موقع پر بھی آپ نے وقت ضائع نہیں کیا۔ پیغمبر ﷺ شخصی طہارت اور قناعت رکھتے تھے آپ میں کسی قسم کا ضعف نہیں پایا جاتا تھا۔ آپ معصوم اور پاکیزہ تھے اور یہ عنصر معاشرہ اور لوگوں پر اثر انداز ہونے میں اہم عامل ہے۔ عمل کے ذریعے تاثیر پیدا کرنا

---

[1] روم/۱۰، (اس کے بعد برائی کرنے والوں کا انجام برا ہوا کہ انہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلا دیا اور برابر ان کا مذاق اڑاتے رہے)

[2] توبہ/۷۷، (تو ان کے بخل نے ان کے دلوں میں نفاق راسخ کر دیا اس دن تک کے لیے جب یہ خدا سے ملاقات کریں گے اس لیے کہ انہوں نے خدا سے کئے ہوئے وعدے کی مخالفت کی ہے اور جھوٹ بولے ہیں)

زبانی اثر انداز ہونے سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ پیغمبر ﷺ کی گفتار دوٹوک اور صریح تھی کبھی بھی غیر واضح اور ذو معنی گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ البتہ جب دشمن کے مقابلے میں ہوتے تو بہت گہری سیاست سے کام لیتے اور دشمن کو غلط فہمی میں ڈال دیتے۔ مومنین اور لوگوں کے ساتھ ہمیشہ صاف، شفاف اور واضح بات کرتے اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں نرمی کا مظاہرہ کرتے جیسے عبداللہ ابن ابیٰ کا قصہ کہ جو خود بہت زیادہ تفصیل رکھتا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے کبھی بھی افراد و گروہ حتیٰ سخت ترین دشمن جیسے مکہ کے کفار کے ساتھ بھی کیے ہوئے عہد وپیمان کو نہیں توڑا۔ گو کہ دوسروں نے عہد شکنی کی جس کا پیغمبر ﷺ نے محکم جواب دیا۔ آپ نے کبھی بھی اپنے عہد وپیمان کی خلاف ورزی نہیں کی اسی لیے سب جانتے تھے کہ اگر آپ کے ساتھ کوئی معاہدہ اور قرارداد ہوئی ہے تو اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف پیغمبر ﷺ نے تضرع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ روز بروز خدا سے اپنے رابطے کو محکم تر کرتے گئے۔ میدان جنگ کے وسط میں کہ جب اپنی فوجوں کو منظم کر رہے ہوتے ، انہیں جنگ کے لیے تیار کر رہے ہوتے، جوش دلا رہے ہوتے ، خود اسلحہ تھام کر اپنی فوج کی سربراہی کر رہے ہوتے یا انہیں ہدایات دے رہے ہوتے تو عین اس وقت گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے ہاتھ خدا کی بارگاہ میں بلند فرماتے اور لوگوں کے سامنے آنسوں بہاتے اور خدا سے گفتگو فرماتے: پروردگارا! تو ہماری مدد فرما، ہماری پشت پناہی فرما، خدایا! تو خود اپنے دشمنوں کو دور کر دے۔ نہ دعا اس کا باعث تھی کہ اپنی قوتوں کو کام میں نہ لائیں اور نہ ہی قدرت اور قوت کا استعمال اس بات کا سبب تھا کہ توسل، تضرع اور خدا کے ساتھ ارتباط سے غافل ہو جائیں۔ دونوں کی طرف آپ کی توجہ تھی۔ آپ کبھی بھی سخت سے سخت دشمن کے سامنے بھی خوف وتردد کا شکار نہیں ہوئے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام جو مظہر شجاعت ہیں فرماتے ہیں

کہ جب جنگ میں حالات سخت ہو جاتے تھے تو ہم پیغمبر ﷺ کے پاس پناہ لیتے تھے۔جب بھی کوئی سختیوں کے موقع پر کمزوری کا احساس کرتا تھا تو وہ پیغمبر ﷺ کے پاس پناہ لیتا تھا۔پیغمبر ﷺ نے دس سال حکومت کی لیکن جو کام آپ نے ان دس سالوں میں انجام دیئے اگر وہ ایک ماہر گروہ کے سپرد کیے جائیں تو وہ سو سالوں میں بھی وہ سارے کام اور خدمتیں انجام دینے سے قاصر ہونگے۔ اگر ہم اپنے آج کے کاموں کو پیغمبر ﷺ کے کاموں کے ساتھ موازنہ کریں تو اس وقت ہمیں سمجھ میں آئے گا کہ پیغمبر ﷺ نے کیا کیا ہے۔ اس حکومت کا نظام چلانا اور مثالی معاشرے کو وجود میں لانا پیغمبر ﷺ کے معجزات میں سے ایک ہے۔

لوگوں نے دس سال آپ کے ساتھ شب و روز گزارے، لوگ ان کے گھر جاتے وہ لوگوں کے گھر تشریف لے جاتے۔مسجد میں ایک ساتھ ہوتے، ساتھ آتے جاتے ، ساتھ سفر کرتے، ایک ساتھ بھوک برداشت کی اور ایک ساتھ خوشی منائی۔پیغمبر ﷺ کی زندگی کی فضا پر نشاط تھی، آپ لوگوں کے ساتھ مذاق کرتے، مقابلے رکھتے اور خود بھی ان مقابلوں میں شرکت فرماتے۔ان لوگوں نے دس سال پیغمبر ﷺ کے گزارے روزبروز آپ کی محبت اور آپ پر اعتقاد ان کے دل میں سرایت کرتا رہا اور جڑیں مضبوط کرتا گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر جب ابو سفیان ،پیغمبر ﷺ کے چچا عباس کی حمایت سے چھپ کر مسلمانوں کے لشکر کے پاس آیا تاکہ امان حاصل کر سکے تو اس نے دیکھا کہ پیغمبر ﷺ وضو کر رہے ہیں اور ان کے اصحاب ان کے گرد جمع ہیں تاکہ آپ کے ہاتھ اور چہرے سے گرتے ہوئے پانی کے قطرات جمع کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ ابو سفیان نے کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ جیسے دنیا کے بڑے اور مقتدر بادشاہ دیکھے ہیں لیکن میں نے ایسی عزت ان میں بھی نہیں دیکھی۔ہاں!

حقیقی عزت معنوی عزت ہے؛(وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین)[1] مومنین بھی اگر اس راہ پر چلیں تو وہ بھی صاحب عزت ہیں۔

نظام اسلام کی پائیداری

غدیر خم کا واقعہ بہت ہی اہم اور اسلامی تاریخ میں اسلامی حکومت کا مستقبل معین کرنے والا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک زاویہ شیعوں سے مخصوص ہے جبکہ دوسرا زاویہ اسلام کے تمام فرقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دوسرے زاویے کے پیش نظر یہ احساس دنیا بھر کے مسلمانوں میں پیدا ہونا چاہیے کہ عید غدیر، جو اس عظیم واقعہ کی یاد گار ہے، صرف شیعوں سے تعلق نہیں رکھتی۔

اس واقعہ سے متعلق پہلی نظر شیعوں سے مخصوص ہے کیونکہ غدیر خم میں امیر المومنین، پیغمبر ﷺ کے ہاتھوں خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسی دن اور اسی واقعہ میں کسی نے رسول خدا ﷺ سے سوال کیا کہ کیا یہ اعلان آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟ فرمایا (من اللہ ورسولہ) امر الٰہی بھی ہے اور میری طرف سے بھی ہے۔ شیعہ اس نظر سے اس واقعہ کو عظیم سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ ان کے امیر المومنین کی بلا فصل خلافت پر اعتقاد کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ البتہ اس واقعہ سے امیر المومنین کی خلافت کے اثبات کے بارے میں اس دن سے لیکر آج تک ہزاروں کتابوں میں بحث ہو چکی ہے اور میں یہاں اس موضوع پر کہ جس پر ہزاروں زبانیں اور قلم کام کر چکے ہیں کچھ اضافہ کرنے کا قصد نہیں

---

[1] عزت صرف اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے (سورہ منافقون،۸)

رکھتا۔ اس واقعہ کی طرف دوسری نظر جو شیعو ں اور سنیوں میں مشترک ہے اور اہمیت کے لحاظ سے پہلی نظر سے کم نہیں ہے،اس کے بارے میں کچھ مزید توضیح دیناچاہتاہوں۔ واقعہ یوں ہے کہ ہجرت کے دسویں سال پیغمبر ﷺ مدینہ اور جزیرۃ العرب کے دوسرے مسلمان ہونے والے علاقوں کے مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اس سفر میں آپ نے حجِ خانہ خدا سے اسلامی معارف کے بیان کے لیے کامل اور قابل توجہ استفادہ فرمایا اور سیاسی، نظامی، اعتقادی، اخلاقی اور دوسرے معارف بیان فرمائے ۔ منیٰ کے مقام پر پیغمبر ﷺ کی دو تقریریں نقل ہوئی ہیں۔ ایک بظاہر دسویں ذی الحجہ کو یا اسی کے آس پاس ہے جبکہ دوسری تقریر کے بارے میں تصریح ہے کہ وہ ایام تشریق کے آخر میں ہے ۔ ان دو تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دو تقریریں ہیں ایک نہیں۔ پیغمبر ﷺ نے ان دونوں تقریروں میں تقریباًان تمام اہم مطالب کو بیان فرمادیا کہ جن کی طرف مسلمانوں کا متوجہ ہونا ضروری ہے۔ ان میں زیادہ تر سیاسی مسائل ہیں۔ انسان یہاں بخوبی اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ لوگ کہ جو اسلام میں حج اور سیاسی مسائل کو جدا تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حج صرف اس عبادت کا حامل ہے کہ جس کو عام طور پر عبادت مانا جاتا ہے اور ہر قسم کا سیاسی کام اس کی حدود سے باہر ہے ،وہ لوگ کس قدر تاریخ اسلام اور پیغمبر اکرم ﷺ کی سیرت سے دور اور بیگانہ ہیں۔

وہ مطالب کہ جو ان تقریروں میں بیان ہوئے ہیں اور جن کو شیعہ اور سنی کتابوں میں نقل کیا گیاہے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے جہاد کے بارے میں گفتگو فرمائی اور مشرکین اور کفار کے ساتھ جہاد کے بارے میں اعلان کیا کہ یہ جہاد باقی رہے گا یہاں تک کہ کلمہ (لا الہ الا اللہ) ہر طرف چھا جائے۔

وحدت اسلامی کے بارے میں مطالب بیان کیے اور تصریح فرمائی کہ مسلمانوں کو داخلی جنگ میں گرفتار نہیں ہونا چاہیے ۔ مسلمانوں کو وحدت اور یکجہتی اور تکلفات سے پرہیز کی بہت زیادہ تاکید فرمائی۔ وہ اقدار جو زمانہ جاہلیت میں باارزش سمجھی جاتی تھیں ان کے بارے میں بڑی صراحت سے فرمایا کہ وہ اسلام کی نظر میں ناچیز اور صفر ہیں اور ہر قسم کی ارزش سے خالی ہیں،(الا و کل ماثرۃ فی الجاہلیہ تحت قدمی ھاتین)[1] وہ اقدار جو زمانہ جاہلیت میں قیمتی اور شرافت کا سبب سمجھی جاتی تھیں میں اس لمحہ ان سب کو اپنے قدموں تلے قرار دیتا ہوں۔ زمانہ جاہلیت کی اقدار کو مکمل طور پر رد فرمایا۔ وہ مالی اختلافات جو زمانہ جاہلیت کی باقیات کے عنوان سے مسلمانوں کے درمیان باقی تھے،مثلاً کسی نے کسی کو قرض دیا تھا اور اب اس مال پر سود کا طلب گار تھا،ان سب کو ختم کیا۔(الا وان کل ربا من الجاہلیہ فھو تحت قدمی ھاتین) وہ پہلا ربوی سود جس کو آپ نے لوگوں کی گردن پر سے ختم کیا وہ آپ کے چچا عباس کا سود تھا۔ آپ کے چچا نے زمانہ جاہلیت میں لوگوں کو قرض دیا تھا اور اب ان میں سے بہت سوں سے سود کے طلب گار تھے۔ آپ نے فرمایا میں نے اس سود کو لوگوں کی گردن پر سے اٹھا لیا ہے اور اسے ختم کر دیا ہے۔ پھر اس بات کی تکرار فرمائی کہ تقویٰ،اسلامی اقدار میں سب سے زیادہ برتر اور اہم ہے۔ اس کی تصریح فرمائی کہ کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ اور پرہیز گاری کی بدولت۔ سیاسی مسائل میں شرکت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ضروری ہے کہ حکمرانوں کو نصیحت کی جائے۔ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ حکمرانوں اور صاحبان اختیار کو اپنی خیر خواہانہ نظر سے آگاہ کریں۔

---

[1] سیرہ النبویہ، ج ۲،ص ۴۱۲

جہان اسلام کے اہم ترین سیاسی اور اجتماعی مسائل کو پیامبر ﷺ نے ان تقاریر میں بیان فرمایا۔ انہی میں حدیث ثقلین بھی ارشاد فرمائی۔ حدیث ثقلین کچھ یوں ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا : میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جارہاہوں،(کتاب اللہ و عترتی) قرآن اور میرے اہل بیت ۔ اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں کو ایک دوسرے کے برابر قرار دیتے ہوئے فرمایا: ان دونوں کی مثال ان دو انگلیوں کی طرح ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک ہاتھ کی پہلی اور دوسری انگلیوں کو بلند کر کے فرمایا: میں قرآن اور عترت کو ان دو انگلیوں کی طرح نہیں سمجھتا کہ جن میں سے ایک دوسری سے بلند ہے بلکہ ان کی مثال دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں کی طرح ہے کہ جس میں سے ایک کو دوسرے پر کسی قسم کی کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔

عترت کے مسئلے کو بیان فرمایا اور اعمال حج انجام دینے کے فوراً بعد مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میان راہ اس جگہ پہنچے کہ جہاں سے یمن کے قافلوں کو مدینہ کے قافلوں سے جدا ہو جانا تھا۔ غدیر خم کے مقام پر پیغمبر ﷺ رک گئے۔ حاضرین بیان کرتے ہیں کہ اس وقت موسم اتنا گرم تھا کہ اگر کچا گوشت زمین پر رکھتے تو وہ پک جاتا۔ ایسی حالت میں پیغمبر ﷺ نے توقف فرمایا اور ایک بلندی پر کھڑے ہو گئے تا کہ لوگ جمع ہو جائیں۔ جب دیکھا کہ سب لوگ جمع ہو گئے ہیں تو پھر ولایت کا اعلان فرمایا(من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ)[1] اور امیر المومنین ؑ کا ہاتھ تھام کر اسے اتنا بلند کیا کہ سب لوگوں کو نظر آ جائے۔ متعدد روایات میں ہے کہ پیغمبر ﷺ نے امام کا ہاتھ تھام کر اس قدر بلند فرمایا کہ بغل کی سفیدی نظر آنے لگی۔ یہ اہتمام اس لیے تھا

[1] الکافی، جلد ۱، ص ۴۲۰

کہ سب لوگوں کو یہ بلند ہاتھ نظر آ سکے۔ یہ اس واقعہ کی اجمالی تصویر ہے۔اس واقعہ کا جو پہلو اس وقت میرے مد نظر ہے وہ اس کا عمومی پہلو ہے جو اسلام کے تمام فرقوں سے تعلق رکھتا ، فقط شیعوں سے مخصوص نہیں ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ اس اعلان میں جو بغیر کسی شک کے انجام پایا اور یہ کلمات[1] آپ کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ، اگر ہم فرض کریں کہ پیغمبر ﷺ امیر المومنین کی بلا فصل خلافت کو بیان نہیں کرنا چاہتے تھے تو کم از کم مسلمانوں کے ساتھ امیر المومنین اور اپنے اہل بیت کے عمیق رابطے اور تعلق کو ضرور بیان کرنا چاہتے تھے۔ کم از کم اس اعلان کے ذریعے اس رابطے کو ذہنوں میں پائیدار اور محکم ضرور کرنا چاہتے تھے۔ یہ جو پیغمبر ﷺ نے منیٰ کے خطبہ میں اور حدیث ثقلین میں ، جو متعدد بار آپ نے بیان فرمائی ہے ،عترت کو قرآن کے برابر قرار دیا ہے اور پھر غدیر خم میں بھی امیر المومنینؑ کی ذات کو محور بناتے ہوئے اس رابطہ کو استوار کیا ہے اس کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ ہے کہ آپ چاہتے تھے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ایک کامل انسان کا نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کریں۔نہ صرف اس زمانے کے لوگوں کے لیے بلکہ تمام آنے والے زمانے کے لوگوں کے لیے ایک کامل انسان کا واقعی، مجسم اور غیر قابل تردید نمونہ پیش کریں اور لوگوں کو سمجھائیں کہ اسلامی تربیت اسی سمت میں اور اسی طرح ہونی چاہئے جیسے اس انسانِ کامل کی تربیت ہوئی ہے۔ ایک مسلمان شخصیت وہ شخصیت ہے جو اسی راستے پر گامزن ہو جس کی انتہا اور کامل تصویر یہ افراد ہیں۔ ایسے افراد جن کی طہارت، تقویٰ، علم ، خدا کے سامنے عبودیت، مسائل اسلامی پر کامل عبور، اسلامی اہداف کے لیے ان کی فداکاری اور ایثار سب کے لیے واضح اور آشکار ہو۔اس

---

[1] من کنت مولاہ فہذا علی مولاہ

لئے آپ صلی اللہ علیہ و آلہِ وسلم نے امیر امومنین کو ایک نمونہ کے طور پر متعارف کروایا تاکہ نہ صرف اس زمانے کے لوگ بلکہ آئندہ نسلیں بھی ان سے رابطہ اور تعلق قائم کریں۔ امیر المومنین عملی طور پر بلافصل خلیفہ نہیں ہوئے لیکن بالآخر پچیس سال بعد تومسند خلافت پر فائز ہوئے، آخر کار آپ کو پوری امت نے رسول خدا کے جانشین اور امت اسلامی کے پیشوا کے طور پر قبول کیا۔ اس شخصیت کو جسے سب جانشین پیغمبر ﷺ کے عنوان سے قبول کرتے ہیں چاہے بلافصل جانشین تسلیم کریں یا چوتھا، اسے تمام حاضر اور آنے والے مسلمانوں کے لیے ایک آئیڈیل اور اسلام کے انسانِ کامل کے عنوان سے تاریخ میں ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔ تا ابد مسلمانوں کا ان کے ساتھ فکری، اعتقادی، جذباتی اور عملی رابطہ برقرار رہنا چاہیے۔

اس نقطہِ نگاہ سے امیر المومنین فقط شیعوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا ان سے گہرا تعلق ہے۔ صرف امیر المومنین سے ہی مختص نہیں ہے بلکہ خاندان پیغمبر ﷺ اور سارے امام جو امیر المومنینؑ کی اولاد میں سے ہیں، وہ بھی چونکہ عترت کا حصہ ہیں اس لیے لازم ہے وہ انسان کامل کے نمونے کے طور پر ہمیشہ مسلمانوں کے سامنے جلوہ گر رہیں۔

دوسرے یہ کہ پیغمبر ﷺ نے عترت کو قرآن کے ساتھ قرار دے کر تحریف قرآن اور اس کے اصلی معنی سے انحراف کے مسئلے کو بھی روشن کر دیا۔ اس وقت جب اہل زور وثروت اپنے فائدے کی خاطر اسلامی مفاہیم میں تحریف کریں، قرآن کی غلط تفسیر کریں اور لوگوں کو گمراہ کریں اور اصلی اسلام اور ان کے درمیان رکاوٹ بن جائیں اس وقت ضروری ہے کہ لوگ اہل بیت کی طرف رجوع کریں۔ یہ اہل بیت ہیں جن کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہی سے نجات دیں، انہیں بتائیں کہ حقیقت کیا ہے، صحیح اسلام کیا ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ جو آج دنیاے اسلام کی ایک اہم ضرورت ہے آج تمام مسلمان محتاج ہیں کہ اہل بیتؑ کے وسیلے سے پہنچنے والے اسلامی معارف سے استفادہ کریں ،چاہے وہ امیر المومنینؑ کی بلا فصل خلافت اور ان کی اولاد کی امامت کے قائل ہوں یہ نہ ہوں۔ البتہ شیعوں کی نظر میں عقیدہ حق اور اس حدیث کا قطعی مطلب امیر المومنینؑ کی بلا فصل خلافت ہے اسی لیے وہ اس کے معتقد اور اس کے پابند ہیں۔وہ لوگ جو اس عقیدے کے پابند نہیں ہیں یعنی ہمارے اہل سنت بھائی،ان پر بھی لازم ہے کہ وہ امیر المومنین اور خاندان پیغمبر ﷺ کے ساتھ اپنے فکری، عقلی، اعتقادی اور قلبی تعلق کو نہ توڑیں۔اس لیے غدیر خم اس دوسرے زاویے سے کہ جو امیر المومنین اور خاندان پیغمبر ﷺ کے مسلمانوں کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کی دعوت دیتا ہے، تمام مسلمانوں سے متعلق ہے۔

غدیر کا مسئلہ صرف ایک تاریخی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کی جامعیت کی نشانی ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے دس سال کی انتھک محنت اور جدوجہد اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک پسماندہ، قدامت پسند اور تعصبات وخرافات سے لبریز معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن اسلامی معاشرے میں تبدیل کر دیا۔اب اگر پیغمبر ﷺ ان دس سالوں سے آگے کی کوئی فکر نہ کرتے اور کوئی راہ اور نقشہ امت کے سامنے پیش نہ کرتے تو ان کا یہ عظیم کام ادھورا اور ناتمام رہ جاتا۔ جاہلیت کی اقدار اور تعصبات کا رسوخ اتنا گہرا تھا جس کو مکمل طور پر دور کرنے کے لیے شاید سالوں درکار تھے ۔ ظاہر کی اصلاح ہو چکی تھی،لوگوں کا ایمان بھی اچھا تھا، لیکن تمام لوگ ایک سطح پر نہیں تھے ،بعض پیغمبر ﷺ کی رحلت سے چھ ماہ یا ایک دو سال پہلے ایمان لائے تھا اور اس ایمان لانے میں بھی اسلام کی جاذبیت کے ساتھ پیغمبر ﷺ کی عسکری قوت کی ہیبت کو بھی دخل تھا۔ سب کے سب تو صدر اسلام کے سے گہرے ایمان

کے حامل مسلمانوں میں شامل نہیں تھے۔زمانہ جاہلیت کے تمام اثرات کو اس معاشرے سے ختم کرنے اور اسے ہدایت کے راستے پر قائم و دائم رکھنے کے لیے تدبیر لازم تھی ۔ اگر یہ تدبیر نہ کی جاتی تو کام ناتمام تھا[1]۔ سورہ مائدہ کی اس آیہ مبارکہ میں اسی مطلب کی نشاندہی کی گئی ہے: (اَلیَومَ اَکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَاَتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِی)[2] یعنی یہ نعمت [3]اس وقت تمام اور کامل ہے کہ جب پیغمبر ﷺ کے بعد کی راہ بھی معین ہو۔ یہ ایک طبیعی چیز ہے۔ پیغمبر ﷺ نے یہ کام غدیر خم میں انجام دیا۔ امیر المومنینؑ کو جن کی شخصیت ایمان، اخلاق، شجاعت ، انقلاب ، مختلف طبقات کے ساتھ حسن معاشرت ، الغرض ہر لحاظ سے ممتاز اور منفرد تھی، منصوب فرمایا اور لوگوں کو ان کی پیروی کا پابند بنایا۔

یہ پیغمبر ﷺ کی فکر نہیں تھی بلکہ ہدایت الٰہی اور دستور الٰہی تھا ،پیغمبر ﷺ کے باقی کلام اور ہدایات کی طرح جو سب کا سب الہام ہے یہ بھی الہامی حکم تھا۔ یہ پیغمبر ﷺ کو خدا کا صریح حکم تھا، پیغمبر ﷺ نے اس حکم پر عمل کیا۔ یہ ہے غدیر جو اسلام کی جامعیت، دور اندیشی اور امت کی ہدایت اور زعامت کی طرف اس کی عمیق نگاہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ امت کے ہادی اور پیشوا کی شرائط کیا ہیں؟ وہی چیزیں ہیں جن کا مظہر امیر المومنینؑ کی ذات ہے ، یعنی تقویٰ، دین کی مکمل پابندی ، غیر خدا اور غیر راہ حق سے صرف نظر نہ کرنا، خدا کی راہ میں بے خطر آگے بڑھنا، علم، عقل، تدبیر، قدرت، عزم اور ارادہ۔ امیر المومنینؑ کو منصوب کرنا ایک

---

[1] بلکہ کام تمام تھا اور منافقین جو آس لگائے بیٹھے تھے کہ رسول کے بعد اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے وہ اس میں کامیاب ہو جاتے۔

[2] مائدہ/ ۳ ،(آج ہم نے تمھارے دین کو تمھارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا)

[3] (نعمت اسلام، نعمت ہدایت، صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی نعمت)

حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی علامت ہے کہ اسلام کی مکمل حیات میں، چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، اسلام کے ہادی اور پیشوا کو انہی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جس کی بنا پر امیر المومنینؑ کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ ہے غدیر کی حقیقت۔

دوسرا باب: امامت

جب معاشرے کی تدبیر کا نظام اپنے عروج پر پہنچتا ہے تو اس نظام کو امامت کہا جاتا ہے۔ اس نظام کے مقابلے میں معاشرے کے کاروبار کو آگے بڑھانے کے لئے کئی اک نظام ہیں جن کا ،منبع و سرچشمہ انسانی کمزوری، اس کی نفسانی خواہشات، خود پرستی اور تکبر ہے۔ اسلام ،امامت کا نسخہ ،بشریت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یعنی ایک ایسا انسان جس کا دل ہدایت الٰہی کے فیض سے سرشار اور لبریز ہو۔ معارف دین کو بھی جانتا ہو یعنی صحیح راستے کو بھی پہچانتا ہو اور عمل کی قدرت بھی رکھتا ہو۔ یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ[1]۔

ایک طرف اس کی جان اور ذاتی خواہشات اس کے لیے اہمیت نہ رکھتی ہوں تو دوسری طرف دوسرے انسانوں کی جان ، ان کی زندگی اور ان کی سعادت اس کے لیے سب کچھ ہو۔ امیر المومنین نے اپنی پانچ سال سے بھی کم عرصہ کی حکومت میں اسی چیز کو میدانِ عمل میں انجام دیا۔ یہ چند سالوں کی حکومت ایک ایسا تابناک نمونہ ہے جو تاریخ میں پوری درخشندگی

---

[1] مریم/۱۲(اے یحیٰ !کتاب کو قوت کے ساتھ تھامو)

کے ساتھ باقی رہا ہے اور آئندہ بھی بشریت اسے ہر گز فراموش نہ کرسکے گی۔ یہ ہے غدیر کے واقعہ کا صحیح معنی اور اس کی صحیح تفسیر۔

امامت کا لفظی مطلب 'پیشوای' ہے لیکن اسلامی ثقافت میں یہ کلمہ معاشرے کی رہبری کے لیے استعمال ہوتا ہے، رہبری چاہے فکری ہو، چاہے سیاسی۔ قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ یا اس کے مشتقات جیسے آئمہؑ(امام کی جمع) استعمال ہوئے ہیں وہ یہی مطلب لئے ہوئے ہیں، یعنی امت کی رہبری ۔ فکری رہبری یا سیاسی رہبری یا پھر دونوں۔ پیغمبر ﷺ کی رحلت کے بعد اسلام کے پیروکاروں میں فکری اور سیاسی اختلاف پیش آیا جس کے نتیجے میں مختلف فرقے وجود میں آئے۔ اس اختلاف کی اصلی وجہ امت کی سیاسی رہبری کے بارے میں اختلاف تھا۔ یہ امر اس بات کا باعث بنا کہ لفظ امام اور امامت زیادہ تر سیاسی رہبر یا رہبری کے معنی میں استعمال ہونے لگا یہاں تک کے اس کے دوسرے معنی اس طرح گم ہوگئے۔ جب دوسری صدی ہجری میں مختلف کلامی مکاتب فکر سامنے آئے اور مختلف اسلامی افکار منظم مکتب اور آئیڈیولوجی کی صورت میں ظاہر ہوئے تو امامت ان میں سے ہر ایک مکتب کا ایک اہم مسئلہ تھا جو اسی سیاسی رہبری کے معنی میں تھا۔ اس مسئلہ امامت میں امام یعنی معاشرے کے حاکم کی شرائط اور خصوصیات کو زیر بحث لایا جاتا تھا اور ہر مکتب فکر اس بارے میں خاص رائے کا حامل تھا۔

مکتب تشیع میں بھی کہ جو اپنے پیروکاروں کے نزدیک اسلام کی اصلی تصویر ہے امامت اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ امام کے بارے میں اس شیعہ مکتب کے نظریہ کا خلاصہ یوں ہوتا ہے: امام ، یعنی اسلامی معاشرے کا زمامدار[1] خدا کی طرف سے منصوب اور پیغمبر ﷺ کے وسیلے

[1] حکمران، باگ ڈور سنبھالنے والا

سے اعلان شدہ۔ ضروری ہے کہ رہبر مفسر قرآن اور اسلام کے تمام اسرار و رموز سے واقف ہو۔ پاک، معصوم، ہر طرح کے خَلقی، خُلقی اور سببی عیب سے دور اور طاہر انساب اور ارحام سے تعلق رکھتا ہو۔ اس طرح لفظ امام، جو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں عام مسلمانوں کے درمیان صرف سیاسی رہبر کے معنی میں استعمال ہوتا تھا شیعوں کے نزدیک سیاسی رہبر کے ساتھ فکری اور اخلاقی رہبر کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

شیعہ جب کسی کو امام کے عنوان سے پہچانتے تو اس سے معاشرے کے امور کے نظم و نسق کے ساتھ فکری رہنمائی، دین کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کی بھی توقع رکھتے تھے۔ اور اگر وہ ان وظائف کی انجام دہی پر قادر نہ ہوتا تو وہ اس کو (امامِ برحق) نہیں مانتے تھے۔ عام مسلمانوں کے نزدیک سیاسی امور کی بخوبی انجام دہی، عسکری قدرت اور کشور کشائی امام ہونے کے معیارات تھے جبکہ شیعہ صرف ان معیارات کی بنیاد پر کسی کی امامت پر قانع نہیں تھے۔

اسی لئے شیعوں کے نزدیک امامت کا مفہوم یہ ہے: معاشرے کا امام یعنی وہ مسلط قدرت جو افراد اور معاشرے کی رفتار اور سمت کو معین کرتی ہے اور ایک ہی وقت میں دین اور اخلاق کی معلم بھی ہے اور لوگوں کی زندگی اور ان کی فعالیت کو واقعیت بھی عطا کرتی ہے۔ اس بیان کے مطابق پیغمبر ﷺ بھی امام ہیں کیونکہ جس معاشرے کی بنیاد انہوں نے ڈالی تھی اس کی سیاسی اور فکری رہبری ان ہی کے کاندھوں پر تھی۔ اسی طرح پیغمبر ﷺ کے بعد بھی معاشرے کو امام کی ضرورت ہے تاکہ پیغمبر ﷺ کی جانشینی میں اس سنگین ذمہ داری کو نبھایا جاسکے۔ سیاسی رہبری بھی اسی ذمہ داری کا ایک جز ہے۔ شیعہ معتقد ہیں کہ پیغمبر ﷺ کے صریح حکم کے مطابق یہ جانشینی سب سے پہلے امیر المومنین اور پھر ان کے بعد ان کی

اولاد میں سے آنے والے معصوم اماموں کو منتقل ہوئی ہے۔(تفصیلی استدلال کے لیے مفصل کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام نے جو یہ امامت اور حکومت کے تین رکن بیان کیے ہیں ؛(سیاسی رہبری)،(دین کی تعلیم)اور(روح کی تہذیب) اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ان تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں جانتا ہے اور حکومت و سیاست کو ان تینوں کناروں کے لیے ایک مشترک اور جامع حل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس مطلب کی بعض ہم عصر علماء نے بھی نشاندہی کی ہے۔ اسی لیے امامت یعنی امت کی ان تین پہلوؤں میں رہبری۔ امامت کے مفہوم کی اسی وسعت کی وجہ سے شیعہ عقیدہ ہے کہ امام کا خدا کی طرف سے معین اور منصوب ہونا لازمی ہے۔اسی بنیاد پر ،بعض لوگوں کے عقیدے کے برخلاف،امام شیعوں کے نزدیک صرف ایک معنوی اور روحانی پیشوا نہیں ہے۔ان کے مطابق امام سیاسی رہبر بھی ہے، یعنی معاشرے کا نظم و نسق سنبھالنا اس کی ذمہ داری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اخلاقی تربیت و رہنمائی اور اسلامی معارف وآئیڈیولوجی کی تعلیم بھی اسی کے وظائف ہیں۔

یہ واضح مطلب، امامت کے معتقدین کی کی ایک کثیر تعداد کی نظروں سے غائب ہے۔اسی لیے مناسب ہے قرآن اور احادیث کی سینکڑوں دلیلوں میں سے چند ایک کو یہاں ذکر کیا جائے:

اصول کافی کی کتاب (الحجۃ) میں امام رضاؑ سے ایک مفصل حدیث نقل ہوئی ہے جس میں آپ نے امامت اور امام کی بہت خوبصورت خصوصیات بیان کی ہیں۔ امامت کی بیان ہونے والی خصوصیات میں سے بعض یہ ہیں:امامت، دین کی سلامتی،مسلمانوں کی سرپرستی اور ان کے امور کا نظم ونسق، دنیا کی آبادی،مومنین کی سربلندی، انبیا کی ہم مرتبہ، اوصیا کی میراث،خدا کی خلافت اور پیغمبر ﷺ کی جانشینی ہے۔ امام کی خصوصیات کے بارے میں امام علیہ السلام

فرماتے ہیں: امام، عمومی ثروت میں اضافہ کرنے والا، حدود اور قانون الٰہی کو اجرا کرنے والا، سرحدوں کا نگہبان، خلق کے درمیان خدا کا امین، خدا کی راہ کو روشن کرنے والا، خدا کے حریم کا محافظ، منافقین کے لیے صاحب غضب، کافروں کی بنیادوں کو مٹانے والا، مومنین کو عزت بخشنے والا، سیاسی اور اجتماعی امور میں ماہر، خدا کے فرمان پر کمربستہ، خدا کے بندوں کا خیر خواہ اور اس کے دین کا نگہبان۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سارے امتیازات اور ان کی ساری ذمہ داریاں ان کے بعد امام علیؑ اور آپؑ کے بعد باقی سارے اماموں کے لیے ہیں۔[2]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ اوصیا کی اطاعت کو واجب قرار دیتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ اوصیاء ہی ہیں کہ جن کو قرآن (اولی الامر) سے تعبیر کرتا ہے۔[3]

مختلف ابواب میں بکھری سینکڑوں روایات صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ امامت، شیعہ نظریہ کے مطابق مسلمانوں کے امور کا نظم اور حکومت ہے اور حکومت کے اصلی حق دار امام ہیں۔ یہ روایات اتنی زیادہ اور واضح ہیں کہ کسی اہل انصاف محقق کے لیے شک کی گنجائش نہیں رہتی اماموں کی طرف سے امامت کا دعویٰ صرف فکری اور معنوی رہبری تک محدود نہیں ہے بلکہ حکومت کے حق کو اور حکومت کے حصول کے لئے سعی کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اماموں کی تمام جگہوں پر پھیلی ہوئی دعوت درحقیقت سیاسی اور عسکری جدو جہد کی طرف دعوت ہے ۔

---

[1] الکافی، جلد ا، ص ۲۰۰

[2] الکافی، جلد ا، ص ۱۹۶

[3] الکافی، جلد، ص ۱۸۹

اگر کسی کا تصور یہ ہے کہ امام سجادؑ سے لیکر امام عسکریؑ تک ہمارے ان آٹھ اماموں نے صرف دین کے احکام اور معارف بیان کیے ہیں اور اپنے زمانے کے حالات کے مطابق سیاسی جدوجہد نہیں کی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے ان ہستیوں کی زندگی میں صحیح سے غور نہیں کیا ہے۔ ان کی سیاسی جدوجہد ان کی زندگی کے حالات سے واضح ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ نظریہ کہ یہ حضرات دین کے معارف بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کرتے تھے اسلام میں امامت کے معنی اور اس کے فلسفے کے خلاف ہے۔ ممکن نہیں ہے کوئی اسلامی نقطہ نگاہ سے امامت کے معنی سے واقف ہو لیکن پھر بھی وہ یقین کر لے کہ تقریباً ۲۰۰ سال تک سارے امام صرف گھر میں بیٹھے دینی معارف بیان کرتے رہے۔ اگر اماموں کے حالات زندگی میں ان کی سیاسی جدوجہد نظر نہ آتی ہو تب بھی ہم اس نظریہ کے قائل نہیں ہو سکتے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی کا یہ لازمی پہلو تاریخ میں نقل نہیں ہوا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں سارے امام سیاسی جدوجہد کرتے رہیں ہیں تو یہاں اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ ہر امام کی جدوجہد اس وقت کے حالات کے مطابق تھی۔ کبھی یہ جدوجہد علمی ، ثقافتی اور سیاسی گروہ تشکیل دینے اور امور کو منظم کرنے کے ذریعے ہے تو کبھی جنگ اور خونی جدوجہد کی شکل میں۔ غرض یہ کہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق جدوجہد کی ایک خاص شکل ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی یہ سوال کرے کس طرح ممکن ہے کہ امام حکومت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کریں جبکہ وہ اپنے الٰہی علم سے جانتے تھے کہ حکومت تک نہیں پہنچ پائیں گے؟ واضح ہے کہ امام اپنی زندگیوں میں حکومت حاصل نہیں کر سکے اور جس طرح وہ چاہتے تھے اور ان کی ذمہ داری تھی اس طرح وہ معاشرے کو نہیں ڈھال سکے۔ لیکن اس بات کا علم کہ ہدف تک نہیں پہنچ پائیں گے کس طرح ذمہ داری پر عمل نہ کرنے کو جائز قرار دے سکتا ہے؟ پیغمبر

ﷺ کی حیات طیبہ کی طرف نگاہ کریں، آپ جانتے تھے جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہو گی، جانتے تھے کہ جن لوگوں کو پہاڑی درے پر مامور کیا ہے وہ مال غنیمت کی لالچ میں وہاں سے ہٹ جائیں گے۔ جب آپ طائف والوں کی ہدایت اور اہل مکہ کے شر سے بچنے کے لیے طائف جارہے تھے آپ عالم تھے کہ وہ پتھروں سے آپ کا استقبال کریں گے۔ اتنی زیادہ آپ پر سنگ باری کریں گے کہ آپ کی پنڈلیاں لہولہان ہو جائیں گی اور آپ کو واپس لوٹنا پڑے گا۔ آئمہ ؑ بھی سب جانتے تھے۔ امام علیؑ جانتے تھے کہ آپ ۲۱ رمضان المبارک کو شہید ہو جائینگے لیکن اس کے باوجود آپ نے کوفہ کے باہر فوجی چھاؤنی قائم کی اور لشکر جمع کرنا شروع کیا تاکہ معاویہ کے مقابلے کے لیے جاسکیں۔ اگر امیر المومنینؑ کا علم اس بات کا باعث ہوتا کہ عام صورت حال کے مطابق عمل نہ کیا جائے تو کیوں آپ نے چھاؤنی لگائی؟ لشکر کو جمع کیا؟ اور کوفے کے لوگوں کو شہر کے باہر منتظر رکھا؟ کس لیے؟ اسی وجہ سے آئمہ کا یہ جاننا کہ وہ حکومت تک رسائی حاصل نہیں کر سکیں گے، اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی کوشش اور جدو جہد سے ہاتھ اٹھالیں۔ ضروری تھا کہ بالکل اس شخص کی طرح کوشش کریں جو نہیں جانتا کہ آگے کیا پیش آئے گا۔

امامت کے چار ادوار

امامت کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کے ماہِ صفر میں پیغمبر ﷺ کی وفات سے شروع ہوتا اور ۲۶۰ صدی ہجری کے ربیع الاول میں امام حسن عسکری ؑ کی شہادت تک مسلمانوں میں جاری رہتا ہے۔ امامت کی اس مدت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جس میں سے ہر ایک دور میں آئمہ کا مسلط حکومت کے ساتھ ایک خاص رویہ نظر آتا ہے۔

پہلا دورہ سکوت یا پھر حکومت کے ساتھ تعاون کا دور ہے۔ اسلامی معاشرہ ابھی نو مولود ہے۔ ایک طرف زخم خوردہ قدرت مند بیرونی دشمن ہیں اور دوسری طرف تازہ مسلمان ہونے والے افراد کہ جو ابھی صحیح طور پر اسلام سے آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ یہ دو عنصر اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اسلامی نومولود معاشرہ کسی اختلاف و نزاع کا شکار ہو۔ اس وقت معاشرے میں معمولی اختلاف بھی اس کی اصل اور اساس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف حق سے انحراف بھی اس حد تک نہیں پہنچا تھا کہ امام علیؑ جیسی ذمہ دار اور اسلام کا درد رکھنے والی شخصیت کے لیے ناقابل تحمل ہو۔ شاید ان ہی وجوہات کی بنا پر پیغمبر اکرم ﷺ نے امیر المومنینؑ کو ان حالات میں صبر کرنے کی وصیت فرمائی تھی۔ یہ دور پیغمبر ﷺ کی وفات سے لیکر ۳۵ ہجری میں امیر المومنینؑ کی ظاہری خلافت کے آغاز تک جاری رہتا ہے۔ اس دور کے آغاز میں امام مصریوں کو خط میں لکھتے ہیں:

فامسکت یدی حتیٰ رایت راجعت الناس قد رجعت عن الاسلام یدعون الی محق دین محمد ﷺ فخشیت ان لم انصر الاسلام و اہلہ ان اری فیہ ثلما او ھدما تکون المصیبہ بہ علی اعظم من فوت ولایتکم فنھضت فی تلک الاحداث[1]

پہلے میں نے حالات سے کنارہ کشی کی لیکن پھر میں نے دیکھا کہ ایک گروہ اسلام سے پلٹ گیا ہے اور اس کی نابودی کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اگر ان حالات میں، میں اسلام اور مسلمانوں کی مدد نہ کروں تو اسلام ایسی خرابی کا شکار ہو جائے گا جس کو برداشت کرنا میرے لیے

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۶۲

تم پر حکومت کے حق کے چھن جانے سے زیادہ سخت ہو گا۔ اسی خاطر میں ان حالات میں اٹھ کھڑا ہوا۔

امام کی زندگی کے یہ پچیس سال، اسلام اور اسلامی معاشرے کے ساتھ خلوص اور دردمندی کی بناپر، خلفا کے ساتھ تعاون اور ان کی حمایت کا زمانہ ہے۔ امام نے اس زمانے میں جو خلفاء کو حکومتی، عسکری اور اجتماعی معاملات میں مشورے دیئے ہیں وہ نہج البلاغہ اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں نقل ہوئے ہیں اور امام کی خلفا کی حمایت پر مبنی اس روش کے ناقابل تردید گواہ ہیں۔

دوسرا دور امامت کی قدرت کا دور ہے۔ امام علیؑ کی حکومت کے چار سال اور نو مہینے اور امام حسنؑ کی چندماہ کی حکومت اس دور کو تشکیل دیتے ہیں۔ تمام تر مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود جن کو ایک انقلابی حکومت سے جدا کرنا تقریباً محال ہے، امامت کا یہ دور حکومت اسلامی کا انتہائی درخشاں باب ہے۔ عدالت، انسانیت کے تقاضوں کا لحاظ، اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں رعایت ہمیں پوری تاریخ میں سب سے زیادہ اسی دور میں نظر آتی ہے۔ امامت کا یہ دور اسلامی طرز حکومت اور اجتماعی عدالت کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ بعد میں آنے والے امام تقریباً دو سو سال تک لوگوں کی اس کی طرف بلاتے رہے اور ایسی ہی حکومت کو ایجاد کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ شیعہ اس دور کو بہت عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ موازنہ کی بنیاد پر بعد میں آنے والی حکومتوں کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ مختصر سازمانہ ایک بہت ہی اہم تجربہ اور اس چیز کا درس تھا کہ جب بھی غیر تربیت یافتہ افراد کے درمیان ایک انقلابی اور صد در صد اسلامی حکومت قائم ہو گی تو اسے کن مشکلات اور کن

دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ باقی امام لوگوں کی سخت جنگی تربیت[1] اور طویل المدت منصوبہ بندی[2] کی مشکلات کو جھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تیسرا دور امام حسنؑ کی صلح (۴۱ ہجری) سے لیکن امام حسینؑ کی شہادت (۶۱ ہجری) تک کے زمانے پر محیط ہے۔ امام حسنؑ کی صلح سے عملی طور پر شیعوں کی نیم مخفی سرگرمیوں اور تحریک کا آغاز ہو جاتا ہے جن کا ہدف مناسب وقت پر حکومت کو اہل بیتؑ کے پاس لوٹانا ہے۔ یہ مناسب وقت ظاہری حالات کی بنا پر بہت زیادہ دور نہیں تھا بلکہ معاویہ کی وفات کے بعد اس کی قوی امید تھی۔ اسی بنیاد پر اس تیسرے دور کو (مختصر مدت میں) حکومت کو اس کے حق دار تک پلٹانے کے لیے تعمیری جدوجہد کا دور کہہ سکتے ہیں۔

چوتھا دور اسی روش کو جاری رکھنے کا دور ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اب حکومت کا قیام مختصر مدت میں نہیں بلکہ طویل مدت میں عمل میں آئے گا۔ یہ دور تقریباً دو سو سال پر محیط اور مختلف مراحل میں کامیابیوں اور شکست سے عبارت ہے جس کے آخر میں نظریات اور آئیڈیولوجی[3] کے میدان میں آخری کامیابی آئمہؑ کے نام ہے۔ اس دور میں ہمیں مختلف روشیں[4]، اخلاص اور فداکاری کی عظیم مثالیں اور انسان کی عظمت و بلندی کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔

آئمہؑ کی وہ خصوصیت جس پر شایان شان توجہ نہیں دی گئی وہ ان ہستیوں کی سیاسی جدوجہد ہے ۔ پہلی صدی کے دوسرے نصف میں جب خلافت اسلامی، سلطنت میں تبدیل ہو گئی اور

Organizational training[1]

Long term planning[2]

Ideological ground[3]

Different tactics[4]

حکومت اسلامی جابرانہ بادشاہی نظام بن کر رہ گئی تو اس وقت حالات کے تقاضوں کے مطابق آئمہ ؑ کی سیاسی جدوجہد اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ اس جدوجہد کا سب سے بڑا ہدف اسلامی نظام کی تشکیل اور امامت کے محور پر حکومت اسلامی کا قیام تھا۔ دین کی وحی الٰہی کے مطابق صحیح تفسیر اور اسلامی معارف سے تحریفات کا خاتمہ بھی اہل بیتؑ کی جدوجہد کے اہم اہداف میں سے تھے۔ البتہ نا قابل تردید قرائن کے مطابق اہل بیتؑ کی جدوجہد صرف ان اہداف تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا سب سے بڑا ہدف (علوی حکومت) اور اسلام کے عادلانہ نظام کا قیام تھا۔ آئمہ اور ان کے اصحاب کی ایثار سے لبریز زندگی کی زیادہ تر دشواریاں اسی ہدف کی وجہ سے تھیں۔ کربلا کے بعد امام سجادؑ کے زمانے سے آئمہ طویل مدت [1] تک اسی ہدف کے حصول کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔

امام حسینؑ کی شہادت سے لیکر امام رضاؑ کی ولی عہدی تک کے تقریباً ۱۴۰ سال ، آئمہ ؑ سے فکری طور پر وابستہ افراد یعنی شیعہ ، حکومت وقت کے لیے سب سے بڑا خطرہ شمار ہوتے تھے۔ اس دوران کئی دفعہ ایسا ہوا کہ مناسب مواقع پیش آئے اور یہ جدوجہد اور تحریک اپنے اصلی ہدف کے بہت قریب پہنچ گئی۔ لیکن ہر دفعہ کچھ ایسے موانع پیش آئے جو اصل کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ اس جدوجہد اور تحریک کو سب سے زیادہ نقصان ان حملوں سے پہنچا جو اس تحریک کے اصلی محور یعنی امام پر کئے گئے اور امام کو یا تو قید یا پھر شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب اگلے امام کی امامت شروع ہوتی تو حکومت کی طرف سے دباؤ اور سختی اتنی بڑھ چکی ہوتی تھی کہ دوبارہ سے تیاری کے لیے پھر سے ایک طویل مدت درکار ہوتی۔

---

[1] Long term

ان تمام تر سخت طوفانوں میں بھی آئمہؑ تدبیر اور شجاعت کے ساتھ تشیع کو ان خطرناک وادیوں سے حفاظت کے ساتھ گذارتے رہے۔ یہ مکتب تعداد کے اعتبار سے قلیل لیکن تیزی اور پائیداری کے اعتبار سے قوی تھا۔ کبھی بھی عباسی اور اموی خلیفہ امام کی شہادت کے ذریعے مکتب امامت کو مٹا نہ سکے اور یہ خطرہ ہمیشہ ان کے سر پر موجود رہا اور ان کے آرام و آسائش کو تہ و بالا کرتا رہا۔

تیسرا باب: امیر المومنین علیہ السلام

امیر المومنینؑ کا وجود مختلف جہات اور تمام شرائط کی رو سے بنی نوع انسان کے لیے ایک لازوال درس ہے۔ آپ کی شخصی زندگی، محراب میں آپ کی عبادت اور مناجات، آپ کا زہد و تقویٰ، شیطان اور نفس سے جنگ، ہر میدان میں آپ تمام بشریت کے لیے مشعل راہ ہیں۔ آپ کا یہ

جملہ آج بھی فضا میں اسی طرح گونج رہا ہے (یا دُنْیَا۔۔غُرّی غَیْرِی) اے دنیا کے جلووں اور اس کی دلفریبیوں کہ جنہوں نے بڑے بڑوں کو اپنے دھوکے میں لے لیا جاؤ علیؑ کے علاوہ کسی اور کو دھوکہ دینے کی کوشش کرو علیؑ اس سے بلند ہے کہ تمھارے دھوکے میں آجائے۔ اسی لیے آپ کی زندگی کے ہر ہر لحظہ میں مومنین کے لیے درس ہیں۔

آپ کی زندگی کا ایک پہلو حق اور عدالت قائم کرنے کے لیے جہاد ہے۔ جب پیغمبر ﷺ نے اپنی رسالت کا آغاز کیا تو اسی وقت آپ ﷺ کو ایک فداکار جانباز مجاہد میسر آگیا تھا۔ جو ابھی تک جوانی کی سرحد سے باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ جانباز,امیر المومنین تھے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کے آخری لمحوں تک اسلامی نظام کے قیام اور اس کی حفاظت نے آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ آپ نے کس قدر جہاد کیا، کتنی زحمتیں اٹھائیں۔ اس وقت جب میدان میں کوئی باقی نہ رہتا تھا آپ ثابت قدم رہتے۔ جب حوصلے پست ہونے لگتے تھے تب آپ ہی کے وجود سے مسلمان مجاہدوں کو نیا حوصلہ اور ہمت ملتی۔

آپ کی نظر میں زندگی کا فلسفہ ہی یہی تھا کہ جو صلاحیتیں اللہ نے انسان کو دی ہیں ان کو حق کی بلندی اور سرفرازی کے لیے استعمال کیا جائے۔ آج دنیا میں اگر حق ،عدل اور انسانیت جیسی چیزوں کی کوئی قیمت [1] ہے تو وہ آپ کی ہی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کی قربانیوں کی بدولت آج حق زندہ ہے۔

---

[1] value

پوری تاریخ میں امیر المومنین جیسی شخصیات بہت ہی کم گذری ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو انسانی قدریں[1] بھی موجود نہ ہوتیں اور انسانیت اپنے اعلیٰ مفاہیم سے عاری ہوتی۔ انسان کے نزدیک تمدن، ثقافت، اعلیٰ انسانی اقدار اور مقاصد جیسی چیزوں کی کوئی وقعت نہ ہوتی ، بلکہ انسان ایک وحشی اور خوفناک درندے میں تبدیل ہو کر رہ جاتا۔ آج پوری انسانیت اپنے اعلیٰ اہداف اور مقاصد کی حفاظت کے لیے امیر المومنین اور ان جیسی عظیم ہستیوں کی زحمتوں کی قرض دار ہے

۔

آپ کی زندگی کا ایک اور پہلو آپ کا طرز حکومت ہے۔ آپ نے اس مختصر سے دور حکومت میں وہ کارنامے انجام دیئے کہ اگر سالہا سال لکھنے والے اس پر لکھتے رہیں، تصویر کشی کرنے والے اس کی تصویر کشی کرتے رہیں اور مورخین اس پر قلم چلاتے رہیں، اس کے باوجود جو کچھ بھی ہو گا وہ کم ہو گا۔ آپ علیہ السلام کا طرز زندگی خود نمونہ عمل ہے۔ آپ نے حکومت کے معنی ہی بدل کر رکھ دیئے۔ آپ علیہ السلام کی حکومت، حکومت الٰہی کا کامل مظہر تھی ۔
آپ مسلمانوں کے درمیان مجسم آیات قرانی تھے،اور اس آیہ شریفہ: (اشداء علی الکفار رحماء بینھم)[2] کا کامل مصداق اور پیکرِ عدالتِ مطلق تھے۔ امام فقیروں کو اپنے نزدیک کرتے تھے ،ضعیفوں اور ناداروں پر خاص عنایت فرماتے تھے۔ وہ افراد کے جو مال و دولت کی بنیاد پر خود کو ناحق دوسروں سے برتر سمجھتے تھے وہ آپ کی نظر میں خاک کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی نظر میں جن چیز کی اہمیت تھی وہ تقویٰ، اخلاص، جہاد اور انسانیت تھیں۔ آپ

---

[1] Human values

[2] فتح/۲۹

نے ان اقدار کے ساتھ پانچ سال سے بھی کم حکومت کی مگر اس حکومت کی توصیف میں آج تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے کم ہے کہ بڑی بڑی نامور شخصیات اس سلسلے میں اظہار عجز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

امام کی سب سے بڑی خصوصیت تقویٰ الٰہی ہے۔ نہج البلاغہ راہ ورسم تقویٰ سکھاتی ہے۔ یہ آیہ شریفہ: (ومن الناس من یشری نفسہ ابتغا مرضات اللہ)[1] امیر المومنین کی شان میں نازل ہوئی ہے اور آپ اس کی تاویل ہیں۔ یہ آیت فرماتی ہے کہ انسانوں کے درمیان کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو اپنی زندگی کو یعنی اپنی عزیز ترین شے کو کہ جس کی تلافی ممکن نہیں، اس تک کو فدا کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں تاکہ خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

(ومن الناس من یشری) بیچ دیتے ہیں۔ کس چیز کو (نفسہ) اپنی جان کو (ابتغا مرضات اللہ) کوئی اور ہدف نہیں رکھتے سوائے خدا کی خوشنودی کے۔ خدا فرماتا ہے ہم بھی اس کے مقابلے میں ناقدری نہیں کریں گے۔

(واللہ رؤوف العباد): خدا اپنے بندوں کے لیے رؤوف اور مہربان ہے اور امیر المومنین اس کے مصداق کامل ہیں۔ میں ان کی زندگی کے اسی گوشہ کو بیان کر رہا ہوں۔

آپ تاریخ اٹھا کر امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ آپ اپنے بچپن سے جب آپ نے نو یا تیرہ سال کی عمر میں رسول اللہ کی نبوت پر اظہار ایمان کیا اور مکمل فہم و فراست اور شعور کے ساتھ حقیقت کو پہچان کر اس سے متمسک ہونے سے لے کر اس وقت تک جب آپ نے انیس رمضان المبارک کی صبح کو محراب عبادت میں اپنی جان راہ خدا

---

[1] بقرہ / ۲۰۷

میں قربان کر دی یعنی لقائے الٰہی کے شوق میں خوشی خوشی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی تقریباان پچاس، ترپین سالوں میں یعنی دس سال سے لیکر تریسٹھ سال کی عمر تک آپ علیہ السلام کے کردار میں تسلسل پایا جاتا ہے اور وہ تسلسل ایثار و قربانی اور اپنی جان کے لئے خطرات کو مول لینا ہے۔ اس پچاس سالہ تاریخ میں امیر المومنین علیہ السلام نے جن حالات کا سامنا کیا وہ ابتداء سے لیکر آخر تک مسلسل ایثار و قربانی سے بھرپور ہیں، یہ ہمارے لئے ایک درس ہے میں اور ہم آپ جیسے لوگ جو ہمیشہ یا علی کہتے رہتے ہیں اور دنیا میں علی علیہ السلام کے چاہنے والوں کے نام سے معروف ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی سے درس حاصل کریں۔ صرف علی علیہ السلام کی محبت یا علی علیہ السلام کے فضائل کی شناخت کافی نہیں ہے۔ ایسے لوگ بہت تھے جو دل سے علی علیہ السلام کے فضائل کا اعتراف کرتے تھے ان میں سے بعض لوگ تو علی علیہ السلام کو ایک پاکیزہ اور معصوم انسان بھی مانتے تھے لیکن ان کے اور علی علیہ السلام کے کردار میں فرق تھا کیونکہ وہ علی علیہ السلام کی خصوصیات کو اپنا نہیں سکتے تھے یعنی وہ اپنی ذات اور خود پسندی کے حصار میں پھنسے ہوئے تھے جبکہ امیر المومنین علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی ذات کے حصار میں گرفتار نہیں تھے۔ لفظ "میں" کی آپ علیہ السلام کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آپ کے ہاں جس چیز کی اہمیت تھی وہ ذمہ داریاں، اہداف اور جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات تھی۔

امیر المومنین علیہ السلام اپنے بچپن میں ہی شہر مکہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی دعوت پر ایمان لے آئے، اس کے ساتھ ہی آپ علیہ السلام کو کافروں کی طرف سے ایذا رسانی، تضحیک و تمسخر اور اہانت کا سامنا کرنا پڑا؛ آپ ذرا ایک ایسے شہر کا تصور کیجئے جس کے باسی طبعی طور پر تشدد پسند، تہذیب و تمدن سے عاری، نرم مزاجی اور سنجیدگی سے تہی دامن،

سخت مزاج، جھگڑالو، فسادی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑنے جھگڑنے والے اور اپنے باطل عقائد کے حق میں شدید متعصب ہوں اور اس قسم کے ناموافق معاشرے میں ایک عظیم انسان نے ایک عظیم انقلابی نظریہ پیش کیاہو، ایک ایسا نظریہ جو اس معاشرے کے عقائد اور آداب ورسوم سمیت تمام چیزوں سے ٹکراتا ہو۔ فطری بات ہے اس معاشرے کے تمام لوگ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ معاشرے کے مختلف طبقات اور عوام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مخالفت شروع کردی۔ ایک ایسے انسان[1] کی حمایت کرتے ہوئے اس کے پیغام پر لبیک کہنا اور اپنی جان کی بازی لگاتے ہوئے اس کی حفاظت پر ڈٹ جانا اور اس سے وابستہ ہونے کا مطلب اپنی جان کے لئے خطرات کو مول لینا ہی تو تھا اور امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی جان کے لئے خطرات مول لئے۔ یہی آپ کی ایثار و فداکاری کا پہلا ثبوت تھا۔ آپ علیہ السلام تیرہ سال تک سخت ترین حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ شانہ بہ شانہ ڈٹے رہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم مجبوری نیز قریش اور مکہ والوں کے دباو کے تحت ہجرت فرمارہے تھے لیکن اس ہجرت کا مستقبل تابناک تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ ہجرت کامیابیوں اور فتوحات کا پیش خیمہ ہے۔ جب ایک تحریک مشکلات و مصائب کے مرحلے سے نکل کر عزت وسکون کے مرحلے میں داخل ہورہی ہو اس وقت عام طور پر سب کی کوشش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد موقع سے فائدہ اٹھائیں اور اگر ہو سکے تو معاشرے میں کوئی عہدہ یا مقام حاصل کرلیں لیکن امیر المومنین علیہ السلام اس اہم موڑ پر رات کی تاریکی میں رسول اکرم

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بستر پر سونے کی تیاری کر رہے ہیں تا کہ رسول اللہ اس گھر اور شہر سے باہر کہیں دور نکل سکیں۔

اس رات بستر رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر سونے والے کا قتل ہونا تقریبا یقینی تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بستر میں کسی کی موجودگی ضروری بھی تھی تا کہ جب جاسوسوں کی وہاں نظر پڑے تو وہ یہ خیال کریں کہ وہاں کوئی موجود ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم مکہ سے نکلنے میں کامیاب ہوں۔ کون حاضر ہے؟ اگر چہ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ایثار بجائے خود ایک غیر معمولی اور عظیم کارنامہ ہے لیکن اس ایثار کا خاص وقت اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہ وقت کونسا ہے؟ یہ وہ وقت ہے جب مشکلات کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اب وقت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم مدینہ میں جا کر حکومت تشکیل دیں۔ مدینہ کے لوگ ایمان لا چکے ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے منتظر ہیں۔ سب کو اس بات کا علم ہے لیکن عین اسی لمحے امیر المومنین علیہ السلام اس جاںنثاری کا مظاہرہ کرتے ہیں اس قسم کا عظیم اقدام وہی کر سکتا ہے جو ہر قسم کے ذاتی مفاد یا مقصد سے ماوراء ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے مدینہ پہنچتے ہی آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی نوخیز اور نئی حکومت رات دن جہاد میں مشغول ہو گئی، ہر وقت جنگ کا سامنا رہا جو اس قسم کی حکومت کی خاصیت بھی ہے۔ جنگ بدر سے بھی پہلے سے لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، ان دس سالوں کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے کفار (ومشرکین) کے انواع و اقسام کے قبیلوں کے ساتھ درجنوں لڑائیاں لڑیں، ان تمام مراحل میں امیر المومنین علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نگہبان، فدائی اور جانباز محافظ کے طور پر لشکر کی صف اول میں موجود رہتے تھے جیسا کہ خود امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولقد واسیتہ بنفسی فی المواطن التی تنکص فیھا الابطال وتتاخر فیھا الاقدام۔[1] میں نے ان مواقع پر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مدد کی جہاں بڑے بڑے پہلوانوں اور بہادروں کے قدم لڑکھڑا جاتے اور وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

سخت ترین مواقع پر بھی امیر المومنین علیہ السلام ڈٹے رہتے تھے۔ آپ کو خطرے کی کوئی پرواہ نہ ہوتی ایسے مواقع پر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اپنی جان بچانی چاہئے تاکہ آئندہ اسلام کی خدمت کر سکیں، لیکن امیر المومنین علیہ السلام نے اس قسم کی تاویلات و توجیہات کے ذریعے کبھی اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیا۔ بلاشبہ امیر المومنین علیہ السلام کی عظیم شخصیت فریب کھانے والی نہیں تھی اس لئے خطرناک مراحل میں آپ صف اول میں موجود رہتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحلت سے خلافت ظاہری تک

جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا دور اپنے اختتام کو پہنچا اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم رحلت فرما گئے تو اس کے ساتھ ہی امیر المومنین علیہ السلام کے زندگی کے تیس سالہ تلخ ترین دور کا آغاز ہوا۔ جبکہ وہ دور بہت پر لطف اور شیرین تھا کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم زندہ تھے اور جب آپ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زیر سایہ جہاد کرتے تھے[2]۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحلت کے ساتھ ہی یہ دور اپنے اختتام کو پہنچا اور ایک تلخ دور

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ، ۱۹۷۔

[2] ۔ نہج البلاغہ

کا آغاز ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد وقفے وقفے سے فتنوں کے تاریک بادل اس طرح چھانے لگے کہ آنکھوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور جو لوگ راہ راست پر چلنا چاہتے تھے ان کے لئے ایک ایک قدم اٹھانا دشوار تھا۔ ان سنگین حالات میں بھی امیر المومنین علیہ السلام نے ایثار و فداکاری کے عظیم ترین باب رقم کئے۔

حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحلت کے بعد امیر المومنین علیہ السلام اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں مصروف ہوگئے آپ اس بات سے بالکل بھی غافل نہ تھے کہ (سقیفہ میں) ایک اجلاس ہو رہا ہے جو عالم اسلام کے آئندہ کی حکومت اور مسلمانوں کے اقتدار کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ آپ کی نظر میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہ تھا بلکہ آپ کو تو اپنی ذات کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جب خلافت کا فیصلہ ہو چکا اور لوگوں نے حضرت ابو بکر کی بیعت کرلی، جو ہونا تھا ہو چکا، تو امیر المومنین علیہ السلام کنارہ کش ہو گئے آپ کی طرف سے کوئی ایسا جملہ، کوئی گفتگو اور کوئی بیان سامنے نہیں آیا جو حکومت وقت سے ٹکراؤ اور محاذ آرائی کی نشاندہی کرتا ہو۔

البتہ آپ علیہ السلام نے ابتدائی دنوں میں یہ کوشش ضرور کی کہ جو چیز آپ کی نظر میں صحیح ہے وہ انجام پائے اور حقدار کو مسند خلافت پر بٹھایا جائے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ لوگ بیعت کر چکے ہیں اور بات ختم ہو گئی ہے کیونکہ حضرت ابو بکر مسلمانوں کے خلیفہ بن گئے ہیں تو اب آپ علیہ السلام نے ایک ایسے انسان کا موقف اپنایا کہ جس کی طرف سے اپنے تمام تر تحفظات اور اعتراضات کے باوجود حکومت وقت کو کسی بھی قسم کا خطرہ یا نقصان پہنچنے کا امکان نہ ہو۔ آپ علیہ السلام کے اس تاریخی کردار کو دنیا جانتی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اس دوران جب اس حکومت کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا شاید کچھ ہی مہینے ہوئے تھے فرمایا: لقد علمتم انی احق الناس بھا من غیری۔ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ خلافت کا

حقدار ہوں۔و اللہ لاسلمن ما سلمت امور المسلمین۔ اللہ کی قسم! جب تک مسلمانوں کے امور سلامتی کے ساتھ چلتے رہیں گے اور جب تک میں یہ دیکھوں کے کسی پر ظلم نہیں ہو رہا ہے اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھا رہوں گا۔ ولم یکن فیھا جور الا علی خاصہ۔ جب تک میرے سوا دوسروں پر ظلم نہ ہو رہا ہو، معاشرے میں ظلم و جور کی حکمرانی نہ ہو اور ظلم صرف میرے اوپر ہو رہا ہو تب تک میں کسی سے سروکار نہیں رکھوں گا اور کوئی مزاحمت یا اعتراض نہیں کروں گا۔[1]

کچھ ہی عرصہ بعد شاید ابھی چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ لوگوں کے مرتد ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، شاید اس کے پیچھے بھی مختلف سازشیں کار فرما تھیں۔ بعض عرب قبائل نے یہ احساس کیا کہ اب چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم یعنی مسلمانوں کے رہبر اور قائد موجود نہیں، لہٰذا موقع ہے کہ کوئی اعتراض اور اشکال کیا جائے یا جنگ چھیڑی جائے شاید اس کے پیچھے منافقین کی سازشیں کار فرما تھیں۔ آخر کار (ردّہ) کا واقعہ پیش آیا یعنی بعض مسلمانوں کے مرتد ہونے سے ردّہ کی جنگ کا آغاز ہوا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو امیر المومنین علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ کنارہ کشی کا وقت نہیں لہٰذا آپ علیہ السلام میدان میں اتر گئے اور اسلام کا دفاع کرنے لگے اور فرمایا: (فَامسَکت یَدِی) یعنی جب خلافت کا مسئلہ پیش آیا اور ابو بکر مسلمانوں کا خلیفہ بن گیا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور کنارہ کش ہو کر بیٹھ گیا: حتی رایت راجعت الناس قد

[1] نہج البلاغہ، خطبہ، ۷۴۔

رجعت یرید محو الاسلام[1] یہاں تک میں نے دیکھا کہ دین سے پھرنے والے کچھ لوگ دین کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں تو پھر میں میدان میں اتر آیا۔

امیر المومنین علیہ السلام ایک فعال کارکن کی صورت میں میدان عمل میں اترے اور تمام اجتماعی امور میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ امیر المومنین علیہ السلام خلفاء کے پچیس سالہ دور میں اپنے فعال کردار کو وزارت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت عثمان کے قتل کے بعد جب لوگ امیر المومنین علیہ السلام کی بیعت کرنے آئے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

و انا لکم وزیراً خیر اًلکم منی امیراً۔ میرا وزیر ہونا، امیر ہونے سے بہتر ہے۔ مجھے حسب سابق وزیر رہنے دو[2]۔

یعنی امام علیہ السلام اپنے پچیس سالہ کردار کو وزارت کا نام دیتے ہیں کیونکہ آپ علیہ السلام بر سر اقتدار خلفاء اور حکمرانوں کی مدد کرتے رہے تھے۔ یہ ایک زبردست اور عظیم ایثار تھا۔ انسان یہ دیکھ کر سچ مچ حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اس معاملہ میں کس قدر ایثار کا ثبوت دیا تھا۔ اس پورے پچیس سالہ دور میں امام علیہ السلام نے حکومت کا تختہ الٹنے، بغاوت کرنے، مقابلہ کرنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحلت کے وقت امیر المومنین علیہ السلام تینتیس سالہ جوان تھے۔ آپ علیہ السلام کی جوانی اور جسمانی قوت جوبن پر تھی، جوانی کا جوش و جذبہ عروج پر تھا۔ آپ علیہ السلام لوگوں کے درمیان محبوب تھے، ذہین و فطین تھے، بے پناہ علم کے حامل

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ، ۶۲۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ، ۹۲

تھے اور ایک انسان میں جتنے کمالات ممکن ہیں وہ سب آپ علیہ السلام کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے اگر آپ علیہ السلام کوئی باغیانہ اقدام کرنا چاہتے تو یقینا کر سکتے تھے لیکن آپ علیہ السلام نے ان پچیس سالوں میں اسلامی معاشرے کے عمومی اور کلی مصلحتوں و مفادات کی حمایت و حفاظت اور خدمت خلق کے علاوہ کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

خلیفہ دوم کی رحلت کے بعد جب چھ رکنی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس میں شریک ہوئے آپ نے یہ نہیں کہا کہ یہ میرے مقابلے کے لوگ نہیں ہیں طلحہ وزبیر کہاں، عبدالرحمن بن عوف اور عثمان کہاں اور میں کہاں؟ یہ شوریٰ خلیفہ دوم کی وصیت کے مطابق وجود میں آئی تھی تاکہ یہ افراد مل بیٹھ کر کسی ایک کو خلیفہ مقرر کر سکیں۔

ان چھ افراد میں سے آپ علیہ السلام کے خلیفہ بننے کے امکانات زیادہ تھے۔ اور عبدالرحمن بن عوف کے ووٹ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی۔ یعنی امیر المومنین علیہ السلام کے دو ووٹ تھے ایک اپنا اور دوسرا زبیر کا، اور عثمان کے بھی دو ووٹ تھے اپنا اور طلحہ کا اور عبدالرحمن بن عوف کے بھی دو ووٹ تھے ایک اپنا اور دوسرا سعد بن ابی وقاص کا لہٰذا عبدالرحمن کے ووٹ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی اگر وہ امیر المومنین علیہ السلام کو ووٹ دیتا تو آپ علیہ السلام خلیفہ بن جاتے اور اگر عثمان کو ووٹ دیتا تو وہ خلیفہ بن سکتے تھے۔

عبدالرحمن بن عوف نے سب سے پہلے امیر المومنین علیہ السلام سے مخاطب ہو کر آپ کے سامنے یہ شرط رکھی کہ آپ علیہ السلام کو اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور سیرت شیخین یعنی ابو بکر اور عمر کی سیرت پر عمل کرنا ہو گا۔ حضرت نے فرمایا: نہیں مجھے اللہ کی کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر عمل کی شرط تو قبول ہے لیکن

شیخین کا طرز عمل ان دونوں کا اجتہاد تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں، میں اپنے اجتہاد پر عمل کروں گا۔ اس موقع پر آپ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اقتدار کی منزل تک پہنچ سکتے تھے لیکن امیر المومنین علیہ السلام نے ایک لمحے کے لئے بھی ایسا کرنا گوارانہ کیا جس کے نتیجے میں آپ کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس موقع پر بھی آپ علیہ السلام نے ایثار سے کام لیا اور اپنی ذاتی پسند کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ کیونکہ آپ نے کبھی بھی اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اصولوں کے سودے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

حضرت عثمان کے دور حکومت کے بارہ سال گزر چکے تو ان پر اعتراضات کی شرح میں اضافہ ہونے لگا۔ اعتراضات کرنے والوں میں سے اکثریت کا تعلق مصر سے تھا جبکہ کچھ لوگ عراق، بصرہ اور دیگر مقامات سے بھی آئے ہوئے تھے۔ یوں ان کی کافی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی انہوں نے عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا اور خلیفہ کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ان حالات میں امیر المومنین علیہ السلام جیسے شخص کو کیا کرنا چاہیئے تھا؟

وہ شخص جو اپنے آپ کو خلافت کا اصلی حقدار سمجھتا ہو، جسے پچیس سال تک اپنے مسلمہ حق سے محروم رکھا گیا ہو اور جسے موجودہ حکمران پر اعتراض بھی ہو وہی شخص اب دیکھ رہا ہو کہ خلیفہ کا گھر محاصرے میں ہے تو آپ سوچیئے کہ اس کا موقف کیا ہونا چاہیئے تھا۔ عام لوگ بلکہ بڑی بڑی شخصیات ان حالات میں کیا طرز عمل اختیار کرتی ہیں؟ وہی طرز عمل جو طلحہ، زبیر اور عائشہ نے اختیار کیا تھا یا دیگر لوگوں نے جو قتل عثمان کے واقعہ میں کسی نہ کسی طرح ملوث تھے۔

حضرت عثمان کا قتل تاریخ اسلام کے اہم ترین سانحات میں سے ایک ہے۔ نہج البلاغہ اور تاریخ اسلام کے دوسرے مآخذ سے خوب واضح ہوتا ہے کہ انہیں کن لوگوں نے قتل کیا اور اس قتل کے پیچھے کون سے عوامل کار فرما تھے۔ جن افراد نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے حضرت

عثمان سے اپنی عقیدت کے اظہار کا سہارا لیا اور ان کی حمایت کا ڈھنڈورا پیٹا انہی نے لوگوں کو اکسایا اور خلافت کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔

عمرو ابن عاص سے جب پوچھا گیا کہ حضرت عثمان کو کس نے قتل کیا؟ اس نے کہا: فلاں (ایک صحابی کا نام لے کر کہا) نے تلوار بنائی، فلاں نے اس کی دھار کو تیز کیا اور فلاں نے تلوار کو زہر سے مسموم کیا اور فلاں نے اس تلوار سے عثمان پر وار کر دیا اور حقیقت میں بھی ایسا ہی تھا۔

اس سانحہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے کمال اخلاص کے ساتھ وہ کردار ادا کیا جسے آپ اپنی شرعی اور اسلامی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ تاریخ کی مسلمہ حقیقتوں میں سے ایک یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے حسنین علیہما السلام کو جو رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دو گراں بہا گوہر اور یادگار تھے، حضرت عثمان کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ خلیفہ کا گھر محاصرے میں تھا اور کھانے پینے کی چیزیں اندر لے جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی ان حالات میں امام علیہ السلام نے خلیفہ کے گھر کے اندر سامان خورد و نوش بھیجا آپ نے بار بار ان لوگوں کے ساتھ مذاکرات کیے جو حضرت عثمان سے ناراض تھے تاکہ ان کے غیظ وغضب کو کم کیا جا سکے اور جب انہوں نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا تو حضرت علی علیہ السلام بہت سخت ناراض ہوئے۔ اس موقع پر آپ علیہ السلام نے کسی قسم کی خواہش، خود خواہی اور خود غرضی کا احساس نہیں کیا جو ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے، امیر المومنین علیہ السلام کے وجود مبارک میں اس چیز کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔

قتلِ عثمان کے بعد امیر المومنین علیہ السلام ایک معروف و معتبر شخصیت، ایک موقع پرست فرد یا ایک نجات بخش لیڈر کے طور پر حصول اقتدار کے لئے آگے بڑھ سکتے تھے جبکہ لوگ بھی آپ کو چاہتے تھے۔ لیکن امیر المومنین علیہ السلام نے اقتدار کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور حکومت

پر قبضہ کرنے کے لئے کوئی غیر منطقی اقدام نہیں کیا۔ امیر المومنین علیہ السلام کا باطن کس قدر عظیم ہے۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:
دَعُونِي وَالْتَمِسُوا غَيْرِي [1] اے لوگو! مجھے چھوڑ دو اور کسی دوسرے کو تلاش کرو۔ اگر تم کسی اور کو حکومت کے لئے منتخب کروگے تو میں اس کے وزیر یا مددگار کے طور پر کام کروں گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو امیر المومنین علیہ السلام نے بیان فرمائیں لیکن لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا، حقیقت میں بھی وہ امیر المومنین علیہ السلام کے علاوہ کسی اور کو مسند اقتدار پر دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

خلافت کا زمانہ

تمام مسلمان علاقوں نے امیر المومنین علیہ السلام کی بیعت کرلی تھی۔ تاریخ اسلام میں امیر المومنین علیہ السلام کی بیعت کی طرح کسی کی بیعت نہیں ہوئی۔ صرف شام والوں نے آپ علیہ السلام کی بیعت نہیں کی۔ اس کے علاوہ تمام مسلمان علاقوں اور بڑے بڑے صحابہ نے آپ علیہ السلام کی بیعت کی تھی۔ صحابہ میں سے چند ایک نے (جن کی تعداد دس سے بھی کم تھی) امیر المومنین علیہ السلام کی بیعت سے انکار کیا تھا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے انہیں مسجد میں طلب کیا اور ان میں سے ہر ایک سے پوچھا کہ وہ بیعت کیوں نہیں کر رہے ہیں ۔ بیعت نہ کرنے والوں میں عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص اور چند دوسرے لوگ شامل تھے۔ جب امیر المومنین علیہ السلام نے ان سے بیعت نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو ہر کسی نے کوئی نہ کوئی عذر یا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ، ۹۲۔

بہانہ پیش کیا۔ بعد میں بعض نے بیعت کر لی لیکن بعض افراد نے جن کی تعداد بہت ہی کم ہے پھر بھی بیعت نہیں کی۔ امام علیہ السلام نے انہیں آزاد چھوڑ دیا۔

ان کے علاوہ دیگر تمام بڑے بڑے مشہور صحابہ جیسے طلحہ اور زبیر وغیرہ آپ علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ بیعت لینے سے پہلے امیر المومنین علیہ السلام نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:(وَاعلموا) جان لو(انی ان اجبتکم)اب جب تم اصرار کر رہے ہو کہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالوں(ر کبت بکم)[1] اور میں تمہارا مطالبہ مان لوں تو یہ خیال نہ کرنا کہ میں کل فلاں مشہور لوگوں یا سر کردہ افراد یا معروف چہروں اور شخصیات کے دباؤمیں آؤں گا۔ یہ مت سوچنا کہ میں فلاں فلاں کی پیروی یا تقلید کروں گا اور دوسروں کی روش پر چلوں گا ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ بلکہ(و اعلموا انی ان اجبتکم ر کبت بکم ما اعلم)میں اسلام کے بارے میں اپنے فہم، اپنے علم و دانش اور اپنی صوابدید کے مطابق تمہیں چلاؤں گا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے یوں لوگوں پر اتمام حجت کرنے کے بعد خلافت کی ذمہ داریوں کو قبول کیا۔ البتہ اس موقع پر بھی امیر المومنین علیہ السلام مختلف مصلحتوں اور حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے نرم رویہ اختیار کر سکتے تھے اور لوگوں کے دل موہ سکتے تھے لیکن آپ نے دو ٹوک اور فیصلہ کن طریقے سے اسلامی اصولوں اور دینی اقدار پر عملدر آمد پر زور دیا۔

یہی وجہ تھی کہ دشمنوں کی کثیر تعداد علی علیہ السلام کے سامنے صف بستہ ہو گئی۔ امیر المومنین علیہ السلام نے ایک محاذ پر دھوکہ بازوں، فریب کاروں اور مال و دولت کے بچاریوں سے جنگ لڑی تو دوسرے محاذ پر آپ کا مقابلہ اسلام کے جانے پہچانے اور معتبر چہروں سے تھا اور تیسرے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ، ۹۲۔

محاذ پر آپ کا سامنا ایسے لوگوں سے تھا کہ جنہوں نے تقدس کا نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ جو ظاہر میں بڑے عبادت گزار تھے لیکن حقیقت میں وہ روح اسلام اور تعلیمات اسلامی سے نا آشنا تھے اور امیر المومنین علیہ السلام کے مقام و منزلت کو بھی نہیں پہچانتے تھے، یہ انتہائی سخت دل اور بد اخلاق لوگ تھے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے تین محاذوں پر تین الگ الگ نظریات کے حامل لوگ یعنی ناکثین، قاسطین اور مارقین سے جنگ کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک واقعہ در حقیقت آپ علیہ السلام کا اللہ تعالی کی ذات پر توکل، ایثار اور خود خواہی سے دوری کا واضح ثبوت ہے اور آخر کار آپ نے اسی راستے میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس لئے آپ علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا کہ امام علی علیہ السلام کو ان کے عدل و انصاف نے خاک و خون میں غلطاں کیا ہے۔

اگر امیر المومنین علیہ السلام چاہتے تو مصلحت سے کام لیتے ہوئے عدل و انصاف کو پس پشت ڈال دیتے اور اسلامی اصولوں اور دینی اقدار پر اپنی شخصیت اور شان و مقام کو ترجیح دیتے تو آپ کا شمار مقتدر ترین اور کامیاب ترین خلفاء میں ہوتا اور کسی کو آپ کے مقابلے میں آنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔ لیکن امیر المومنین علیہ السلام چونکہ حق و باطل کا معیار ہیں، لہٰذا جو بھی آپ علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے آپ علیہ السلام کو حق مانتا ہے اور آپ علیہ السلام ہی کی سیرت پر عمل کرنا چاہتا ہے وہ حق پر ہے اور جو بھی آپ علیہ السلام کو نہیں مانتا وہ باطل پر ہے۔ اس لئے آپ علیہ السلام نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے وقت ذرہ برابر بھی خود خواہی اور شخصی مفادات کو مد نظر نہیں رکھا بلکہ آپ علیہ السلام نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا ہمیشہ اسی پر چلتے رہے۔ حقیقت میں امیر المومنین علیہ السلام میزان حق ہیں یہ ہے امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی۔

(و من الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ)[1] کی آیت صرف آپ علیہ السلام کی شہادت سے متعلق نہیں ہے کہ آپ علیہ السلام نے اللہ تعالی کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی (بلکہ) آپ علیہ السلام نے تو اپنی پوری زندگی کو اللہ کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اس اہم نکتے پر توجہ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اسلامی اصول اور دینی اقدار جو اسلام کے گوشہ نشینی کے دور میں اور ایک چھوٹے سے اسلامی معاشرے کے لئے وضع کئے گئے تھے وہ اصول ایک ترقی یافتہ اور وسیع اسلامی معاشرے کے لئے بھی کار آمد ہیں۔ اسلامی اصول، عدالتِ اسلامی، انسانیت کا احترام، جہاد کا جذبہ، اسلامی اور اخلاقی اقدار جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دور میں وحی الٰہی کی صورت میں نازل ہو چکے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذریعے ممکن حد تک اسلامی معاشرے میں نافذ ہو چکے تھے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کا اسلامی معاشرہ کتنا وسیع تھا؟ دس سال تک تو اسلامی معاشرہ صرف مدینہ تک محدود تھا جو چند ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اس کے بعد جب مکہ اور طائف کو فتح کیا گیا تب بھی مملکت اسلامی ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود تھی جس کے پاس محدود مال و دولت، وسائل کی انتہائی کمی اور ہر طرف غربت ہی غربت تھی، ایک ایسے معاشرے میں اسلامی اقدار کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اس دنیا سے کوچ کئے ہوئے پچیس سال بیت چکے ہیں ان پچیس سالوں میں مملکت اسلامیہ کوئی دو گنا یا تین گنا نہیں بلکہ تقریبا سو گنا وسعت پیدا کر چکی

---

[1] سورہ بقرہ، آیہ ۲۰۷

ہے یعنی جب امیر المومنین امام علی علیہ السلام مسند خلافت پر متمکن ہو گئے اس وقت وسطی ایشیاء سے لے کر شمالی آفریقا(یعنی مصر)تک کے علاقے حکومت اسلامی کے زیر فرمان تھے اسلامی حکومت کے ہمسایہ دو بڑی طاقتوں یعنی ایران اور روم میں سے ایک مکمل طور پر تسخیر ہو چکی تھی اور ایران کے تمام علاقے اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آچکے تھے جبکہ (مملکت) روم کے بھی اہم علاقے جیسے فلسطین کے اطراف کے علاقے، موصل اور دیگر مقامات اسلام کے قلمرو میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک وسیع سرزمین حکومت اسلامی کے اختیار میں تھی، اسی لحاظ سے حکومت اسلامی کا خزانہ بھرا ہوا تھا اب فقر و غربت اور غذائی قلت کا مسئلہ در پیش نہ تھا، سونے کا کاروبار رواج پا چکا تھا، پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی، بہت سارا مال و دولت حاصل ہو چکا تھا، حکومت اسلامی مال دار ہو چکی تھی اور بہت سے لوگ حد سے زیادہ مال و دولت کے مالک بن چکے تھے۔ اگر ہم حضرت علی علیہ السلام کو ان کے درمیان سے الگ کر دیں تو ممکن ہے کہ تاریخ یوں فیصلہ کرتی کہ اسلامی اصول اور نبوی اقدار اچھے تو تھے مگر وہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اس مختصر دور اور اس غریب معاشرے کے لئے لیکن اس کے بعد جب اسلامی معاشرہ وسیع ہو کر مختلف تہذیبوں سے مل گیا، ایران، روم اور دیگر تہذیبوں کے اثرات لوگوں کی زندگیوں میں داخل ہوئے اور مختلف اقوام اور قبائل کے لوگ اسلام کی چھتری تلے آئے تو اس صورت حال میں وہ اصول اور قوانین ناکافی ہیں اور ان اصولوں کے ذریعے اسلامی معاشرے کو چلایا نہیں جاسکتا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے پانچ سالہ دور میں اپنے عمل، اپنی سیرت اور طرزِ حکومت کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ اگر نظام حکومت علی علیہ السلام جیسے مقتدر خلیفہ [1] کے ہاتھ میں ہو تو توحید، عدل و انصاف، لوگوں کے درمیان مساوات اور برابری جیسے وہ اصول جنکو نبوی دور کے اصولوں کے نام سے جانا جاتا ہے، اب بھی نافذ ہو سکتے ہیں۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو تاریخ میں محفوظ ہے [اور تاریخ اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکی]۔

اگرچہ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد یہ طریقِ کار جاری نہ رہ سکا لیکن آپ علیہ السلام نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر مملکت اسلامی کا سربراہ، اسلامی معاشرے کے قائدین اور ذمہ دار افراد، راسخ اعتقاد کے ساتھ عمل کرنا چاہیں تو انہی اصولوں کو ایک وسیع و عریض مملکت پر بھی لاگو کر سکتے ہیں اور انہیں لوگوں کے لئے فائدہ مند بھی بنا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ جیسے معاشرے میں عدل و انصاف سے کام لینا جہاں کی کل آبادی دس سے پندرہ ہزار افراد پر مشتمل تھی اور ایسے معاشرے میں عدل و انصاف سے کام لینا جہاں کی آبادی لاکھوں بلکہ کروڑوں نفوس پر مشتمل ہو جیسے امیر المومنین علیہ السلام کا دور، تو ان دونوں میں بڑا فرق ہے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اس کام کو عملی طور پر کر دکھایا۔ میں یہاں پر امیر المومنین علیہ السلام کے چند اقدامات کا تذکرہ کروں گا جو خود آپ علیہ السلام ہی کے بیانات اور احکامات سے واضح ہو جاتے ہیں اگرچہ آپ علیہ السلام کی زندگی میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔

لوگوں نے جب آپ علیہ السلام کے ہاتھوں پر بیعت کرنی چاہی تو آپ علیہ السلام نے اسے قبول نہیں کیا لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھ گیا، چھوٹے بڑے قبائل کے سردار، صحابہ کرام سب نے

[1] جانشین رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

کہا علی علیہ السلام کے علاوہ ہمیں کوئی اور قبول نہیں یہ سب حضرت کی خدمت میں پہنچے اور آپ علیہ السلام کو مجبور کرنے لگے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: اگر ایسا ہی ہے تو پھر مسجد چلتے ہیں، مسجد میں جا کر آپ علیہ السلام منبر پر تشریف لے گئے اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا اپنے اس خطبہ میں آپ علیہ السلام نے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے فرمایا: میں جہاں کہیں بھی دیکھوں گا کہ بیت المال سے، منتخب اور اثر رسوخ رکھنے والے معزز لوگوں کو بغیر استحقاق کے کچھ دیا گیا ہے تو میں اسے واپس بیت المال میں لوٹاؤں گا۔ اگر ان چند سالوں میں کسی نے بغیر استحقاق کے بیت المال میں سے کوئی چیز اپنے لئے اٹھائی ہے تو میں اسے واپس لے لوں گا(لو وجدته قد تزوج به النساء) اگر چہ اسے اپنی عورتوں کا مہر قرار دیا گیا ہو یا(و ملک به الاماء) اس رقم سے اپنے لئے کنیزیں خریدی گئی ہوں (لرددته) "[1] میں ان رقوم کو بیت المال میں واپس لوٹاؤں گا لوگوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ میرا طریقہ کار یہی ہے۔

[لہٰذا] کچھ ہی دنوں کے بعد آپ علیہ السلام کی مخالفت شروع ہو گئی۔ البتہ معاشرے کا مظلوم اور پسماندہ طبقہ دعا کر رہا تھا کہ یہ سلسلہ باقی رہے لیکن با اثر طبقہ اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو اس کا حقیقی مخاطب سمجھ رہے تھے، ظاہر ہے کہ وہ اس بات سے ناراض تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایک اجلاس بلایا اور کہنے لگے کہ یہ علی علیہ السلام کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ولید بن عقبہ (یہ وہی شخص تھا جو حضرت عثمان کے دور خلافت میں کوفہ کا گورنر تھا) ان لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے امام علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گیا اور کہا: اے علی علیہ السلام! آپ سے ہماری بیعت مشروط ہے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ، ۲۹۔

: (نحن نبایعک الیوم علی ان تضع عنا ما تصبناه من المال فی ایام عثمان)[1] ہماری شرط یہ کہ ہمارے پاس جو مال و دولت ہے اس پر ہاتھ نہیں لگائیں گے اور آپ کے دور خلافت سے پہلے ہم نے جو جائیداد حاصل کی ہے اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ولید بن عقبہ کے بعد طلحہ اور زبیر بھی آ گئے۔ گو کہ طلحہ و زبیر اور ولید بن عقبہ کے معاملے میں فرق ہے۔

ولید بن عقبہ کا شمار نو مسلموں میں ہوتا تھا اسکے خاندان کا تعلق اسلام اور انقلاب کے مخالفین سے تھا اور وہ اسلام کے خلاف کئی جنگیں لڑ چکا تھا لیکن جب اسلام غالب آ گیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زندگی کے آخری دور میں اس نے بھی بنو امیہ کے دوسرے افراد کی طرح اسلام قبول کیا تھا لیکن طلحہ اور زبیر کا شمار سابقین اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے قریبی اصحاب میں ہوتا تھا وہ بھی امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئے اور گلہ و شکوہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ (انک جعلت حقنا فی القسم کحق غیرنا) آپ نے بیت المال کی تقسیم میں ہمیں دوسروں کے برابر قرار دیا ہے۔ (وسویت بیننا و بین من لا یماثلنا) ہمیں ان لوگوں کے برابر سمجھا ہے جو کسی بھی لحاظ سے ہم جیسے نہیں۔ یہ کونسا طریقہ ہے؟ آخر آپ فرق کے قائل کیوں نہیں ہیں؟ (من لا یماثلنا فیما افاء اللہ تعالی بأسیافنا و رماحنا)[2] یہ جو بیت المال ہے ہماری ہی تلواروں اور ہمارے ہی نیزوں کے ذریعہ ملا ہے۔ ہم ہی نے اسلام کو ترقی دی ہے۔ ہم ہی نے زحمتیں برداشت کی ہیں اور اب آپ ہمیں

---

[1] بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۱۹۔

[2] بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۲۱۔

ان لوگوں کے برابر قرار دے رہے ہیں جو تازہ مسلمان ہوئے ہیں اور جن کا تعلق مفتوحہ علاقوں سے ہے؟
امیرالمومنین علیہ السلام نے ولید بن عقبہ کو کیا جواب دیا اسے میں نے کہیں نہیں دیکھا کیونکہ تاریخ نے اسے محفوظ نہیں کیا ہے لیکن دوسروں کو جواب دیا ہے آپ علیہ السلام منبر پر تشریف لے گئے اور بہت ہی تند و تیز لہجے میں بیت المال کے برابر تقسیم کرنے کے حوالے سے فرمایا: (فأن ذلک امر لم احکم فیہ بادی بدء) اس طریقہ کار کا بانی میں تو نہیں ہوں (وجدت انا و انتم رسول اللہ یحکم بذلک)[1] میں نے اور آپ سب نے دیکھا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس طرح کیا کرتے تھے، میں نے کوئی نیا کام نہیں کیا بلکہ میں تو آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اسی روش پر عمل کر رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ انہی اقدار اور بنیادی و عملی عقائد کو آج کے معاشرے میں بھی نافذ کروں[2]۔ حضرت علی علیہ السلام نے انہیں نافذ کر دکھایا گو اس کی ان کو قیمت چکانی پڑی۔اس قیمت کو تین جنگوں کی صورت میں ادا کیا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے لیکن جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحلت کے بعد ایسا ہو نہ سکا تو آپ علیہ السلام نے اپنے اس مسلمہ حق کے دفاع کے لئے کسی قسم کی جدوجہد نہیں کی اور پچیس سال تک صبر کیا اگر کوئی دوسرا شخص بھی اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا تو آپ علیہ السلام اسے بھی

---

[1] بحارالانوار، ج ۳۲، ص ۲۲۔

[2] جو زمانہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یادگار ہیں۔

خاموش کرا دیتے تھے:(انک لقلق الوضین ترسل فی غیر سدد و دع عنک نھبا صیح فی حجراتہ)[1] امیر المومنین علیہ السلام سے منسوب اس قسم کے واقعات بہت زیادہ ہیں۔ آپ علیہ السلام نے اس معاملے پر پچیس سال کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا، لیکن ایسے مسائل پر جو بظاہر اس پہلے والے مسئلہ (خلافت) سے کمتر دکھائی دیتے ہیں یعنی اجتماعی عدالت کا مسئلہ، مسئلہ احیاء اقدار نبوی صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور اسلامی اصولوں کا احیاء، آپ علیہ السلام نے تین جنگیں یعنی جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان لڑیں ۔ آپ اندازہ کیجئے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی نظر میں یہ کتنا اہم کام تھا۔ یہی امیر المومنین علیہ السلام کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اور فرمان بھی موجود ہے، اگر ہم علوی معارف سے آشنا ہو جائیں تو برا نہیں، آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:(لا تمنعنکم رعایتہ الحق لاحد عن اقامتہ الحق علیہ)[2] یعنی اگر کوئی انسان مومن ہے، کوئی مجاہد فی سبیل اللہ ہے، اس نے زحمتیں اٹھائی ہیں، محاذ جنگ پر رہا ہے، بڑے بڑے کارنامہ انجام دیئے ہیں تو ایسے شخص کے حقوق کا احترام کرنا تم پر واجب ہے اور کسی موقع پر یہی شخص کوئی خطا کرے اور کسی کا حق ضائع کردے تو اس کے سابقہ کارناموں کو اس خطا کی سزا دینے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے لہٰذا مسائل کو ایک دوسرے سے علیحدہ کریں۔ اگر کوئی

---

[1] تم بہت تنگ حوصلہ ہو اور غلط راستہ پر چل پڑے ہو اور اس لوٹ مار کا ذکر چھوڑو جس کا شور چاروں طرف مچا ہوا تھا۔(نہج البلاغہ، خطبہ، ۱۶۲)

[2] غرر الحکم و درر الکلم، ص۷۹۔

اچھا آدمی ہے، کوئی اہم شخصیت ہے اسکا ماضی شاندار رہا ہے، اس نے اسلام اور اسلامی مملکت کے لئے زحمتیں اٹھائی ہیں تو بہت اچھا، اسکا حق محفوظ ہے وہ ہمارے لئے قابل احترام ہے۔ لیکن اگر یہی شخص کوئی خطا کر بیٹھے تو اسکی گذشتہ اچھائیوں کی وجہ سے اس کی اس خطا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی امیرالمومنین علیہ السلام کی منطق ہے۔

نجاشی نامی ایک شاعر جس کا شمار امیرالمومنین علیہ السلام کے چاہنے والوں اور آپ علیہ السلام کے مداحوں میں ہوتا تھا جس نے جنگ صفین میں اپنے بہترین اشعار کے ذریعے لوگوں کو معاویہ کے خلاف جنگ پر ابھارا تھا جو اخلاص،ولایت کو قبول کرنے اور اپنے سابقہ کارناموں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ماہ رمضان المبارک میں شراب نوشی کی اور جب امیرالمومنین علیہ السلام کو اطلاع ملی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: شراب نوشی کی سزا تو معین ہے اسے لایا جائے تاکہ اس پر حد جاری کی جاسکے۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے اس پر شراب نوشی کی حد جاری کی اور اسے کوڑے مارے۔ نجاشی کے خاندان اور اسکے گھر والوں کو جب پتا چلا تو وہ امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئے اور کہنے لگے: یاعلیؑ! آپ نے تو ہمیں بے آبرو کر دیا وہ تو آپ کے چاہنے والوں اور دوستوں میں سے تھا یعنی آج کی اصطلاح میں آپ ہی کی پارٹی کا آدمی تھا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے ایک مسلمان نے ایک غلط کام کیا تھا جس پر ایک حد الٰہی واجب ہو گئی تھی اور میں نے اس حد کو جاری کر دیا ہے۔ جاشی نے امیرالمومنین علیہ السلام کے ہاتھ سے کوڑے کھانے کے بعد کہا: اگر ایسا ہے تو پھر آج کے بعد میں معاویہ کے بارے میں شعر کہوں گا یہ کہہ کر امیرالمومنین علیہ السلام سے جدا ہو گیا اور معاویہ کے حلقہ سے ملحق ہو گیا۔

اس موقع پر امیرالمومنین علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں افسوس ہوا کہ نجاشی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اسے روکنا چاہیئے۔ نہیں! بلکہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: اگر وہ جا رہا ہے تو جانے دو۔ البتہ نہ جاتا تو بہتر تھا۔ یہ تھی امیرالمومنین علیہ السلام کی منطق اور آپکا طریقہ کار۔ آپ علیہ السلام نے نجاشی کے دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:(فهل هو الا رجل من المسلمین انتهک حرمه من حرم الله فاقمنا علیه حد أکان کفاراته) [1] یعنی ہمارے حد جاری کرنے سے اس کے گناہ جھڑ گئے۔

قبیلہ بنی اسد جو حضرت علی علیہ السلام کے رشتہ دار بھی تھے ان کے ایک شخص پر کوئی حد واجب ہو گئی تھی اس قبیلہ کے بعض لوگ جو امیرالمومنین علیہ السلام کے چاہنے والے تھے کہنے لگے کہ جا کر اس مسئلے کو حل کرتے ہیں اور وہ پہلے حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے تا کہ آپ علیہ السلام کو امام علی علیہ السلام کے پاس سفارش کے لئے بھیجیں۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا میرے جانے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ لوگ خود ہی چلے جائیں کیونکہ میرے بابا آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ لوگ خود ہی حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کی: ہمارے لئے یہ مشکل در پیش ہے لہٰذا ہماری مدد کیجئے۔ حضرت نے فرمایا: جو کام میرے اختیار میں ہوگا میں اسے ضروری انجام دونگا۔ یہ لوگ خوشی خوشی وہاں سے نکل گئے راستے میں جب ان کی ملاقات امام حسن علیہ السلام سے ہوئی تو آپ علیہ

[1] _ کیاوہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے؟ اس نے حکم الٰہی کی حرمت کو پامال کیا تھا اور ہم نے بھی ایک حد کو جو اس کا کفارہ ہے اس پر جاری کیا ہے۔ (الحیاۃ، مترجم احمد آرام، ج ۲، ص ۱۴۷)

السلام نے پوچھا کہ آپ کے کام کا کیا ہوا؟ کہنے لگے الحمدللہ اچھا ہوا حضرت نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔امام حسن علیہ السلام نے پوچھا کہ حضرت نے کیا وعدہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ہم سے وعدہ کیا ہے کہ جو کام ان کے اختیار میں ہو گا وہ ضرور کریں گے۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام مسکراتے ہوئے کہنے لگے: تو پھر جاؤ جا کر حد جاری کروانے کی تیاری کرو۔ بعد میں جب امیر المومنین علیہ السلام نے اس شخص پر حد جاری کی تو وہ لوگ آکر اعتراض کرنے لگے: یا علی! اس شخص پر کیوں حد جاری کی؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: حد تو میرے اختیار میں نہیں ہے یہ حکم الٰہی ہے میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ میرے اختیار میں ہو گا وہ انجام دونگا اور حد میرے اختیار میں نہیں ہے[1]۔ جبکہ بنی اسد امیر المومنین علیہ السلام کے چاہنے والوں میں سے تھے یہ حضرت علی علیہ السلام کا طرز زندگی تھا۔

آپ علیہ السلام کے کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے اور معیشت کے بارے میں بہت سی باتیں نقل کی گئی ہیں راوی کہتا ہے کہ ایک دن میں نے دیکھا کی حسنین علیہما السلام بیٹھے ہوئے تھے اور کھانا کھا رہے تھے ان کا کھانا روٹی، سرکہ اور سبزی پر مشتمل تھا میں نے کہا اے شہزادو آپ امیر المومنین علیہ السلام کے بیٹے ہو آپ کا تعلق حکمران گھرانے سے ہے بازار میں کھانے پینے کی اتنی ساری چیزیں دستیاب ہیں:(وَفی الرّحبۃِ ما فیھا)یعنی رحبہ (کوفہ کے نزدیک ایک جگہ کا نام ہے) میں بھی اتنا کچھ موجود ہے کہ لوگ وہاں سے استفادہ کرتے ہیں اور آپ شہزادوں کا کھانا یہ ہے؟ حسنین علیہما السلام نے راوی کی طرف رخ کر کے کہا:(ما اغفلک عن امیر المومنین

---

[1] دعائم الاسلام، ج۲، ص ۴۴۳۔

)[1]یعنی تم امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جاؤ جا کر آپ علیہ السلام کی زندگی کو دیکھ لو! حضرت کا اپنے اہل خانہ کے ساتھ بھی یہی سلوک تھا۔

آپ نے حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کا ابو رافع سے (ایک گلوبند) امانت لینے کا واقعہ سنا ہو گا اور اسی طرح جناب عقیل کا واقعہ بھی سنا ہو گا وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپ علیہ السلام سے مدد مانگی تھی (صاع عن بر) وہ تھوڑا اضافی گندم چاہتے تھے، لیکن حضرت نے دھکتا ہوا لوہا اٹھایا اور ان کے قریب لے جا کر ڈرایا اور ان کی درخواست قبول نہیں کیا۔ عبد اللہ بن جعفر جو آپ علیہ السلام کے بھتیجے اور داماد یعنی حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کے شوہر نامدار تھے حضرت کی خدمت میں آکر عرض کرتے ہیں: چچا جان! میں تنگ دست ہو گیا ہوں اور گھریلو ضروریات کو فروخت کرنے پر مجبور ہوں لہٰذا میری مدد کیجئے، لیکن آپ علیہ السلام نے ان کی درخواست کو بھی قبول نہیں کیا اور فرمایا: کیا تم مجھ سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہارا چچا جا کر چوری کرے اور لوگوں کا مال اٹھا کر تمہیں دے دے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زمانے کی طرح اپنے زمانے کی ایک ترقی یافتہ، وسیع، متمدن اور دولتمند حکومت کے ذریعے ایک معاشرے پر اسلامی حکومت کی سمت کو معین اور واضح کر دیا۔ اس دور میں ہر شعبے میں ترقی ہوئی تھی لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اپنے عمل کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ ہر صورت میں دور نبوی کے اصولوں کو زندہ رکھا جا سکتا ہے اور یہ امیر المومنین علیہ السلام کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ معنویت، عدل، جہاد، لوگوں کی اصلاح، نیک اور شائستہ منتظمین کی تربیت جیسے کارناموں سے آپ کی زندگی پُر

[1] ـ المناقب، ج ۲، ص ۱۰۸۔

ہے جن کے بارے میں آپ حضرات متعدد بار مختلف روایتوں اور داستانوں میں سن چکے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تمام حالات میں ان اصولوں پر عمل کیا جاسکتا ہے اور یہ حقیقت بھی مدّ نظر رکھنی چاہیئے کہ اسلامی اصولوں کی پاسداری سے یہ مراد نہیں ہے کہ جو لباس امیر المومنین علیہ السلام پہنتے تھے، ہم بھی وہ لباس پہننا شروع کر دیں بلکہ اسلامی اصولوں سے مراد، عدالت، توحید، لوگوں سے عدل و انصاف، لوگوں کے حقوق کا احترام، کمزوروں کی مدد، مخالفین اسلام کا مقابلہ، حق اور حقیقت کا دفاع وغیرہ ہیں، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ہر دور میں قابل اجراء ہیں۔

البتہ آج جب ہم یہ باتیں کر رہے ہیں تو حقیقت میں (انسانیت کی بلندترین) چوٹی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ کیا کوئی شخص امیر المومنین علیہ السلام جیسا بننے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ نہیں، کوئی بھی شخص آپ علیہ السلام جیسا نہیں بن سکتا۔ امام زین العابدین علیہ السلام جو حضرت علی علیہ السلام کے پوتے تھے اور امامت و عصمت کے مقام پر بھی فائز تھے، جب آپ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ اتنی ساری عبادت کرتے ہیں تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہماری عبادت کہاں اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی عبادت کہاں؟ یعنی امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں علی علیہ السلام کے ساتھ موازنہ کے قابل نہیں ہوں۔ جبکہ امام زین العابدین علیہ السلام اور آج کے ہمارے زمانے کے بہترین عابدوں اور زاہدوں کے درمیان بھی ہزاروں فرسخ کا فاصلہ ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے نمونہ کے طور پر عظمت کی بلند چوٹی اور تحریک کے رخ کی نشاندہی کرتے ہوئے سمت کا تعین کر دیا ہے اب جہاں تک ہم سے ہو سکے اسلامی نظام اور نظام عدل و

انصاف پر چلتے ہوئے لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کریں، انسانی حقوق کا احترام کریں اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت کریں۔

کیونکہ پوری تاریخ میں انسانوں کی مشکلات یہی چیزیں رہی ہیں، بشریت ہمیشہ انہی مشکلات میں گرفتار رہی ہے اور آج بھی گرفتار ہے۔ اقوام انہی زور اور زبردستیوں سے نقصانات اٹھاتی ہیں اور ان کی زندگیاں دشوار ہو جاتی ہیں۔ آج کے نظام اسلام، امیر المومنین علیہ السلام کی منطق اور حکومت علوی کی منطق ایسی چیزوں کے ساتھ ڈٹ کر مقابلے کرنے سے عبارت ہیں چاہے ایسے ظالم کسی ایک معاشرے کے اندر طاقت کے استعمال کے ذریعہ ظلم و جور کا بازار گرم کرنا چاہتے ہوں یا عالمی اور بین الاقوامی سطح پر کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام کی زندگی میں اقتدار، مظلومیت اور کامیابی

اس عظیم اور بزرگوار شخصیت کی زندگی میں تین عناصر جو بظاہر ایک دوسرے سے کوئی زیادہ میل نہیں کھاتے جمع ہو گئے ہیں۔ وہ تین عناصر درج ذیل ہیں: اقتدار، مظومیت اور کامیابی۔

آپ علیہ السلام کے اقتدار سے مراد آپ علیہ السلام کی فولادی قوتِ ارادی، آپ علیہ السلام کا عزمِ مصمم، آپ کا مشکل سے مشکل فوجی اور جنگی میدانوں میں سرگرم عمل ہو کر عالی ترین اسلامی اور انسانی مفاہیم کی طرف ذہنوں اور فکروں کی ہدایت کرتے ہوئے مالک اشتر، عمار، ابن عباس اور محمد بن ابی بکر جیسے افراد کی تربیت کرنا اور تاریخ بشریت میں ایک انقلاب کی بنیاد ڈالنا ہے۔ ان بزرگوار کا مظہر اقتدار، منطق کی حاکمیت، فکر و سیاست کی بالادستی اور اقتدار حکومت جو آپ کے شجاع و توانا بازو کا اقتدار تھا۔

امیر المومنین علیہ السلام کی ذات والا صفات میں کہیں سے بھی کوئی کمزوری نہیں پائی جاتی، مگر اس کے باوجود آپ علیہ السلام تاریخ کے مظلوم ترین انسان ہیں۔ آپ علیہ السلام کی زندگی کے ہر پہلو میں مظلومیت نمایاں تھی، آپ علیہ السلام نوجوانی سے ہی مظلوم واقع ہوئے تھے، جوانی میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رحلت کے بعد سے مظلوم تھے، بڑھاپے میں مظلوم تھے، شہادت کے بعد بھی برسہابرس تک منبروں سے آپ علیہ السلام پر سب وشتم ہوتا رہا، جھوٹی تہمتیں لگائی گئیں یہاں تک کہ آپ علیہ السلام کی شہادت بھی مظلومانہ تھی۔

تمام اسلامی آثار میں دو شخصیات ایسی ہیں جن کو (ثَارَ اللہ) سے تعبیر کیا گیا ہے البتہ دیگر زبانوں میں ہمارے پاس اس عربی لفظ (ثار) کا متبادل نہیں پایا جاتا جس کو ہم پیش کر سکیں۔ عربی میں اس وقت لفظ (ثار) استعمال ہوتا ہے جب کسی خاندان کا کوئی فرد ظلم وستم کے ذریعے ناحق قتل کر دیا جاتا ہے اور مقتول کا خاندان خون بہا کا مالک ہوتا ہے اسی کو (ثار) کہتے ہیں کہ یہ خاندان خون بہا کا حق رکھتا ہیں، اگر اس معنی میں خون خدا کہیں کہا جاتا ہے تو یہ لفظ (ثار) کی ایک ناقص اور بہت نارسا تعبیر ہے، اس کا مکمل مفہوم اس سے واضح نہیں ہوتا، تاریخ اسلام میں دو لوگوں کا نام آیا ہے جن کے خون بہا کا حق خدا کو ہے، ان میں ایک امام حسین علیہ السلام اور دوسری شخصیت امیر المومنین علیہ السلام ہیں: یَاثَارَ اللہِ وَابنِ ثَارِہِ[1] یعنی آپ علیہ السلام کے والد بزرگوار کے خون بہا کا حق بھی خداوند کریم کو ہے۔

اور تیسرا عنصر امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی کامیابی ہے کہ سب سے پہلے آپ علیہ السلام اپنی زندگی کے ان تمام دشوار ترین حالات (جو آپ علیہ السلام پر مسلط کئے گئے تھے) میں

---

[1] الکافی، ج۴، ص۵۷۶۔

کامیاب ہوئے۔ یعنی دشمن اپنے تمام تر کمر شکن محاذوں کے باوجود آپ علیہ السلام کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کر سکا بلکہ خود دشمن کو ہی آپ علیہ السلام کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی۔ آپ علیہ السلام کی شہادت کے بعد بھی روز بروز آپ علیہ السلام کی درخشاں حقیقت اور شخصیت آشکار ہوتی گئی بلکہ آپ علیہ السلام کی زندگی کی تابندگی سے بھی زیادہ آشکار ہو گئی۔

آج آپ دنیا پر نظر ڈالیں تو نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ پوری دنیا میں علی علیہ السلام کے گن گانے والے موجود ہیں یہاں تک کہ جو لوگ اسلام کو نہیں مانتے وہ بھی علی ابن ابی طالب علیہم السلام کو تاریخ کی ایک درخشاں شخصیت کے طور پر قبول کرتے ہیں اور یہ وہی درخشاں حقیقت ہے جس کی تابندگی آشکار ہے۔ یہ وہ انعام ہے جسے اللہ تعالی نے آپ علیہ السلام کی مظلومیت کے صلہ میں عطا فرمایا ہے۔ آپ علیہ السلام کی وہ مظلومیت، آپ علیہ السلام کا گلا گھونٹنے کی کوششیں، آپ علیہ السلام پر ناروا تہمتیں لگا کر خورشید کے چہرے کو دھندلا کرنے کی سعی اور ان تمام چیزوں کے مقابلہ میں آپ علیہ السلام کا صبر و استقامت، آخر اللہ تعالی کی طرف سے کچھ انعام تو ہو گا۔ آپ علیہ السلام کے لئے اللہ کا انعام یہ ہے کہ ہم تاریخ بشریت میں کوئی ایسا چہرہ نہیں دکھا سکتے جو آپ علیہ السلام سے زیادہ تابناک، درخشاں اور تمام لوگوں کے لئے قابل قبول ہو۔

شاید آج تک امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں لکھی گئیں کتابوں میں، سب سے زیادہ محبت آمیز اور عاشقانہ انداز کی کتابیں اکثر غیر مسلموں کی لکھی ہوئی ہیں، مجھے یاد ہے کہ تین عیسائی مصنفین نے حضرت علی علیہ السلام کی مدح و ستائش میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ واقعاً عاشقانہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام سے محبت اور عقیدت روز اول ہی سے شروع ہوئی یعنی آپ علیہ السلام کی شہادت کے بعد جب آپ علیہ السلام کے خلاف جھوٹے

پروپیگنڈے کا بازار گرم تھا، حکومت شام سے وابستہ صاحبان اقتدار اور ان کے پیروکار جن کے دلوں کا، علی علیہ السلام کی عدالت کی تلوار نے خون کر دیا تھا وہ آپ علیہ السلام کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ آپ علیہ السلام سے اظہار محبت کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا، میں یہاں پر اس سلسے میں ایک مثال آپ کی خدمت میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جب انسان تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو ان حقائق کو سمجھ سکتا ہے۔ خاندان زبیر میں سوائے مصعب بن زبیر کے سب لوگ علی علیہ السلام سے بغض و عناد رکھتے تھے، مصعب بن زبیر ایک شجاع اور سخی آدمی تھا جس نے کوفہ میں حضرت مختار کے ساتھ جنگ کی اور بعد میں عبدالملک سے بھی جنگ لڑی، اس کے علاوہ آل زبیر کے تمام لوگ پشت در پشت حضرت علی علیہ السلام سے بغض و عناد رکھتے تھے۔ عبداللہ بن عروہ بن زبیر کے بیٹے نے اپنے باپ کے سامنے امیر المومنین علیہ السلام کی بدگوئی کی، جب لڑکے نے برا بھلا کہا تو اس کے باپ نے ایک جملہ کہا اگرچہ وہ جملہ مکمل طور پر علی علیہ السلام کے حق میں تو نہیں، مگر اس میں ایک اہم نکتہ موجود ہے جسے میں بیان کرنا چاہتا ہوں (وہ یہ ہے) عبداللہ اپنے بیٹے سے کہتا ہے: (و اللہ ما بنی الناس شیئا قط الا ھدمہ الدین شیئا فاستطاعت الدنیا ھدمہ)[1] خدا کی قسم! دین نے جس چیز کی بھی بنیاد ڈالی یعنی جس چیز کی بنیاد رکھی گئی اہل دنیا نے لاکھ اسے مٹانے کی کوشش کی مگر اسے نہ مٹا سکے اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا۔ علی علیہ السلام کو بدنام کرنے اور ان کے چہرے کو غبار آلود کرنے کی خواہ مخواہ کوشش نہ کرو (کیونکہ) علی علیہ السلام کے ہر کام کی بنیاد دین اور ایمان پر ہے۔ پھر مزید کہتا ہے: (الم تر الی علی کیف تظھر بنو مروان من عیبہ و ذمہ و اللہ لکأ نما یا

---

[1] نثر الدر، ج۳، ص۱۸۶۔

خذون بناصیتہ رفعا الی السماء) ذرا دیکھو کہ بنو مروان کس طرح ہر موقع پر منبر سے علی علیہ السلام کی عیب جوئی کرتے ہیں! مگر ان کی یہ عیب جوئی اور بد گوئی آپ علیہ السلام کے درخشاں چہرے کو اور بھی روشن کرتی ہے۔ یعنی لوگوں کے ذہنوں میں ان کے اس عمل کا الٹا اثر پڑتا ہے۔ علی علیہ السلام کے مقابلے میں بنو امیہ ہیں:(وما تری یندبون بہ موتاھم من المدیح و اللہ لکأنما یکشفون بہ عن الجیف) بنو امیہ اپنے آباء واجداد کی تعریفیں کرتے پھرتے ہیں مگر وہ ان کی جتنی ستائش کرتے ہیں، ان کے متعلق لوگوں کی نفرت مزید بڑھتی ہے۔ یہ باتیں تقریبا حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے کوئی تیس سال بعد کی ہیں، یعنی امیر المومنین علیہ السلام اپنی تمام تر مظلومیت کے باوجود اپنی زندگی میں بھی، تاریخ میں بھی اور لوگوں کے اذہان و افکار میں بھی کامیاب رہے ہیں۔

آپ علیہ السلام کی مظلومیت کے ساتھ آپ علیہ السلام کی حکومت کا جو خاتمہ ہوا اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ آپ علیہ السلام کے دور حکومت میں (جس کی مدت پانچ سال سے بھی کم ہے) تین قسم کے گروہوں نے آپ علیہ السلام کے مقابلے میں صف آرائی کی، قاسطین، ناکثین اور مارقین۔ اہل تشیع اور اہل سنت دونوں کی کتابوں میں امیر المومنین علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

(امرت ان اقاتل الناکثین و القاسطین و المارقین)[1]۔ اور (ان لوگوں کے) یہ نام بھی آپ علیہ السلام نے خود ہی رکھے ہیں۔ قاسطین کے معنی ستمگر اور ظالم کے ہیں، عربی قاعدے کے لحاظ سے جب "قسطُ" مجرد استعمال ہو گا جیسے (قَسَطَ یَقسِطُ، یعنی جَارَ یَجُورُ، ظَلَمَ یَظلِمُ) تو یہ ظلم

[1] میں ناکثین، قاسطین اور مارقین کے ساتھ جنگ پر مامور کیا گیا ہوں۔ (بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۶)

کرنے کے معنی میں ہو گا اور اگر یہی مادہ ثلاثی مزید اور باب افعال میں لے جایا جائے تو پھر عدل و انصاف کا معنی دے گا جیسے "اَقسَطَ یُقسِطُ" یعنی عدل و انصاف۔ لہٰذا اگر "قسط" کو باب افعال میں لے جایا جائے تو عدل و انصاف کے معنی میں ہو گا اور اگر ثلاثی مجرد میں استعمال ہو جیسے (قَسَطَ یَقسِطُ) تو پھر اس کے خلاف معنی دے گا یعنی ظلم و جور۔ یہاں قاسطین، ظلم و جور کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی ستمگر اور ظلم کرنے والے۔

حضرت نے ان کا نام ظالم رکھا ہے، یہ کون لوگ تھے؟ یہ ان لوگوں کا گروہ تھا جنہوں نے مصلحتاً اور ظاہراً اسلام قبول کیا تھا اور یہ لوگ علوی حکومت کو سرے سے مانتے ہی نہیں تھے، امیر المومنین علیہ السلام نے ان کے ساتھ جو کچھ بھی کیا اسکا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ لوگ شام کے گورنر معاویہ بن سفیان کے حمایتی لوگ تھے انکا اہم لیڈر معاویہ تھا اسکے بعد مروان بن حکم اور پھر ان کے بعد ولید بن عقبہ تھا۔

یہ لوگ ایک محاذ پر اکٹھے تھے جو امام علی علیہ السلام کے ساتھ کسی بھی صورت میں تعاون کرنے کے لئے تیار نہ تھے یہ بات بھی درست ہے کہ آپ علیہ السلام کی حکومت کے آغاز ہی میں مغیرہ بن شعبہ، عبد اللہ بن عباس اور دوسرے لوگوں نے امیر المومنین علیہ السلام سے کہا تھا: اے امیر المومنین علیہ السلام انہیں کچھ عرصے کے لئے اپنے منصب اور حالت پر رہنے دیجئے۔ مگر حضرت نے ان کی اس رائے کو قبول نہیں کیا۔ اس وقت لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ علیہ السلام کو سیاست نہیں آتی لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ علیہ السلام کو مشورہ دینے والے یہ لوگ خود بے خبر تھے کیونکہ امیر المومنین علی علیہ السلام کچھ بھی کرتے معاویہ آپ علیہ السلام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا اس کی کھوپڑی میں وہ دماغ ہی نہیں تھا جو علوی حکومت کو قبول کر سکے۔ اگرچہ آپ علیہ السلام سے پہلے والے ان میں سے بعض کو برداشت

کرتے آئے تھے۔ معاویہ کے مسلمان ہونے سے لیکر امیر المومنین علیہ السلام سے جنگ کرنے تک کوئی تیس سال سے کچھ کم مدت کا عرصہ گزرا تھا۔ معاویہ اور اسکے حامیوں نے سالہا سال شام پر حکومت کی تھی اور لوگوں میں اثر و نفوذ پیدا کیا تھا اور اپنے لئے ایک مرکز بنایا تھا۔ اب وہ شروع کا دور نہیں تھا کہ انہیں نو مسلم کہہ کر روکا ٹوکا جاتا بلکہ انہوں نے اپنی جگہ مضبوط کرلی تھی۔ لہٰذا وہ کسی بھی صورت میں علوی حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ حکومت کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے لوگوں نے بعد میں اس کا تجربہ بھی کرلیا اور دنیائے اسلام نے ان کی حکومت کا مزہ بھی خوب چکھا۔ وہی معاویہ جو امام علی علیہ السلام سے چپقلش اور رقابت کے دوران بعض اصحاب کے ساتھ نرمی و ملائمت سے پیش آتا تھا بعد میں اسی کی حکومت نے ان کے ساتھ سخت رویہ اپنایا یہاں تک کہ یزید کا زمانہ آیا اور واقعہ کربلا رونما ہوا اس کے بعد مروان، عبدالملک، حجاج بن یوسف ثقفی اور یوسف بن عمر ثقفی جیسے خونخوار لوگ حاکم بنے جو اسی حکومت و امارت کا ایک تلخ نتیجہ تھا یعنی یہی حکومتیں جن کے جرائم کے بیان سے تاریخ کانپتی ہے (جیسے حجاج کی حکومت) اُسی حکومت کا ثمرہ تھا جس کی بنیاد معاویہ نے رکھی تھی اور اس طرح کے کام کے لئے امیر المومنین علیہ السلام سے جنگ کی تھی۔ یہ تو ابتدا ہی سے معلوم تھا کہ ان لوگوں کا کیا ارادہ ہے اور کیا چاہتے ہیں، یعنی یہ لوگ دنیا پرستی، خود غرضی اور اپنی خواہشات پر مبنی ایک دنیوی حکومت چاہتے تھے جیسا کہ بنو امیہ کی حکومت میں لوگوں نے اس چیز کو اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

میں یہاں کوئی عقیدتی یا کلامی بحث نہیں کر رہا ہوں، بلکہ تاریخی حقائق آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور یہ کوئی شیعہ تاریخ بھی نہیں ہے بلکہ تاریخ "ابن اثیر" تاریخ "ابن قتیبہ" وغیرہ

سے ہے جس کی اصل عبارتیں میں نے لکھی ہیں اور یہاں میں نے جو لکھا یہ مسلّماتِ تاریخ میں سے ہیں جس میں شیعہ سنی اختلاف کی کوئی بات نہیں ہے!

دوسرا گروہ جس نے امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ جنگ کی وہ ناکثین تھے، ناکثین یعنی توڑنے والے لوگ اور یہاں پر اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو پہلے تو امام علی علیہ السلام کے ہاتھ بیعت کر چکے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اسے توڑ دیا۔ یہ لوگ مسلمان تھے اور اس پہلے والے گروہ (قاسطین) کے مقابلے میں اپنے ہی آدمی تھے۔

البتہ یہ ایسے تھے جو حکومت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو اسی حد تک قبول کرنے کو تیار تھے جہاں تک خود ان کو اس سے خاطر خواہ فائدہ ملے، یعنی ان سے رائے لی جائے اور مشورہ لیا جائے، انہیں حکومتی سطح پر ذمہ داریاں دی جائیں، انہیں حاکم بنایا جائے جو مال و ثروت ان کے ہاتھوں میں ہے اس کے بارے میں کوئی باز پرس نہ کی جائے، یہ نہ پوچھا جائے کہ کیسے اسے حاصل کیا ہے؟ یہ گروہ امیر المومنین علیہ السلام کو (خلیفہ) مانتا تھا مگر اس گروہ کی طرف سے شرط یہ تھی کہ ان مذکورہ چیزوں کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیۓ، یہ نہ کہا جائے کہ یہ مال و دولت کیوں جمع کیا ہے، کہاں سے اکٹھا کیا ہے، اسے کیوں کھا رہے ہو، کیوں لے جا رہے ہو اور دیگر اس قسم کے سوالات نہیں ہونا چاہیۓ! لہٰذا پہلے تو ان کی اکثریت نے بیعت کی تھی (البتہ کچھ لوگوں نے بیعت نہیں کی اور سعد بن ابی وقاص نے شروع ہی سے بیعت نہیں کی تھی، لیکن جناب طلحہ و زبیر اور دیگر بزرگ اصحاب آپ علیہ السلام کی خلافت کو تسلیم کرتے ہوئے آپ علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے) لیکن تین چار ماہ بعد انہوں نے دیکھا کہ اس حکومت کے ساتھ چلا نہیں جا سکتا کیونکہ (ان کے گمان میں) یہ ایک ایسی حکومت تھی جو دوست اور آشنا کو نہیں جانتی تھی، جو اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کسی امتیازی حق کی قائل نہیں ہے۔

(اگرچہ سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے خود امام علی علیہ السلام ہی ہیں) احکام الٰہی اور حدود کے اجراء میں کسی کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جب ان چیزوں کو دیکھا تو کہا نہیں جناب اس آدمی کے ساتھ تو ہم نہیں چل سکتے۔

لہٰذا یہ لوگ آپ علیہ السلام سے الگ ہوئے اور جنگ جمل کے اس فتنے کو بھڑکا دیا جو حقیقت میں ایک فتنہ تھا انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ بہت سارے لوگ اس جنگ میں کام آگئے البتہ فتح و کامرانی امیر المومنین علیہ السلام کو نصیب ہوئی اور آپ نے معاملے کو صاف کر دیا۔ یہ ایک (دوسرا) محاذ تھا جس نے ایک مدت تک امیر المومنین علیہ السلام کو مشغول کئے رکھا۔

تیسرا گروہ مارقین کا تھا "مارق" یعنی گریز کرنے والا۔ ان کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ لوگ دین سے اس طرح نکل گئے تھے جس طرح ایک تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ جب آپ تیر کو کمان میں رکھ کر پھینکتے ہیں تو وہ کمان سے باہر نکل جاتا ہے اور کمان سے گریزاں ہوتے ہوئے اس سے دور ہو جاتا ہے اسی طرح یہ لوگ بھی دین سے دور ہو گئے تھے۔ البتہ وہ ظواہر دین سے متمسک بھی تھے اور دین کا نام بھی لیتے تھے، یہ خوارج تھے۔ یہ ایسے لوگوں کا گروہ تھا جو اپنی کج فکری اور انحراف (جو ایک انتہائی خطرناک چیز ہے) کی بنیاد پر کاموں کو انجام دیتے تھے۔

وہ دین کو علی بن ابی طالب علیہ السلام (جو مفسر قرآن اور علم کتاب کے حقیقی معلم بھی تھے) سے حاصل کرنے کی بجائے اپنے غلط سلط طریقوں سے حاصل کرتے تھے۔ البتہ ایسے لوگ ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان کا ایک باقاعدہ گروہ کی شکل میں نمودار ہونے یعنی آج کی اصطلاح میں ایک پارٹی کی شکل اختیار کرنے کے لئے سیاست کی ضرورت تھی اور اس سیاست کے لئے وہ کہیں اور سے راہنمائی لیتے تھے۔

اہم بات یہ ہے کہ اس چھوٹے سے گروہ کے افراد کے سامنے جب آپ علیہ السلام کچھ کہتے تو وہ فوراً قرآن مجید کی ایک لمبی سی آیت تلاوت کرتے تھے۔ کبھی یہ امیر المومنین علیہ السلام کی نماز جماعت کے درمیان آجاتے تھے اور کنایتاً آپ علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کوئی آیت پڑھتے تھے۔ آپ علیہ السلام کے خطبہ کے درمیان کھڑے ہو جاتے تھے اور اشارے کنائے میں کوئی آیت تلاوت کرتے تھے، انکا مشہور نعرہ "لَا حُكمَ اِلّا لِلّٰہِ"[1] تھا؛ یعنی ہم آپ کی حکومت کو قبول نہیں کرتے ہم تو صرف خدا کی حکومت کو مانتے ہیں۔

یہ ایسے لوگ تھے کہ جن کا ظاہر ایسا تھا لیکن ان کی پالیسیاں اور انہیں چلانے کا کام حکومت شام اور بزرگان قاسطین (یعنی عمرو عاص اور معاویہ) انجام دیتے تھے اور وہیں سے ہی انہیں سیاسی طور پر ہدایات ملتی تھیں، کیونکہ ان لوگوں کے آپس میں روابط تھے۔ جیسا کہ مختلف قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اشعث ابن قیس (مارقین کا سردار) ایک بے ایمان شخص تھا اور کچھ کمزور عقیدہ رکھنے والے بیچارے اور کمزور افراد اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔

پس جس تیسرے گروہ سے امیر المومنین علیہ السلام کو سامنا کرنا پڑا وہ مارقین تھے البتہ آپ علیہ السلام کو اس گروہ کے مقابلے میں بھی کامیابی ملی اور جنگ نہروان میں آپ نے انہیں زبردست شکست دی لیکن معاشرے میں انکا وجود باقی رہا اور آخر کار انہی کے ہاتھوں امیر المومنین علیہ السلام کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

خوارج کی پہچان میں غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ بعض لوگ خوارج کو خشک مقدسوں سے تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بحث مقدس مآب یا خشک مقدس کی نہیں ہے، کیونکہ مقدس

[1] حکمرانی کا حق صرف خدا کو ہے۔

ماٰب لوگ تو کسی گوشے میں بیٹھ کر نمازوں اور دعاؤں میں مشغول رہتے ہیں جبکہ خوارج ایسے لوگ نہیں تھے، بلکہ یہ ایسے لوگوں کا ایک گروہ تھا جو فتنہ و فساد کو بھڑکاتا، بحران پیدا کرتا اور لڑنے جھگڑنے کے لئے میدان میں کود پڑتا تھا اور امیر المومنین علیہ السلام جیسی (عظیم) شخصیت سے جنگ کے لئے تیار تھا، اس گروہ کے اس کام کی بنیاد غلط تھی، ان کی جنگ غلط تھی، اس کے اسباب غلط تھے اور ہدف باطل تھا۔ یہ وہ تین گروہ تھے جن کے ساتھ امیر المومنین علیہ السلام نے جنگ کی اور ان جیسے لوگوں سے امام علی علیہ السلام کو سامنا کرنا پڑا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات مبارکہ، آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حکومت اور امیر المومنین علیہ السلام کے دور حکومت میں جو خاص فرق تھا وہ یہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات طیبہ میں محاذ معین تھے ایک طرف ایمان کا محاذ تھا تو دوسری طرف کفر کا محاذ تھا جہاں تک منافقین کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں مسلسل آیات قرآنی لوگوں کو خبرار اور ہوشیار کرتی رہتی تھیں اور انکی نشاندہی کرتی تھیں اور ان کے مقابلے میں مومنین کو قوت فراہم کرتی تھیں اور ان منافقین کو نفسیاتی طور پر کمزور کرتی تھیں یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دور حیات اور نظام اسلامی میں ساری چیزیں واضح تھیں، صفیں معین اور ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑی تھیں کوئی نظام کفر، طاغوت اور جاہلیت کی صف میں موجود تھا تو کوئی ایمان، اسلام، توحید اور معنویت کے صف میں تھا۔ اس دور میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود تھے مگر صفیں مشخص اور معین تھیں۔

لیکن امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں مسئلہ یہ تھا کہ صفیں واضح نہیں تھیں کیونکہ دوسرے گروہ یعنی ناکثین میں ایسے افراد موجود تھے جن کا شمار جانے پہچانے لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں دیکھ کر لوگ شک وتردید کا شکار ہو جاتے تھے جیسے زبیر اور طلحہ وغیرہ۔ یہ زبیر وہ شخص تھا جس کا

شمار آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دور میں اکابر اصحاب اور اہم شخصیات میں ہوتا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور آپ کے قریبی لوگوں میں سے تھا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اس کا شمار ان لوگوں میں سے ہوتا تھا جنہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کا دفاع کرتے ہوئے سقیفہ کے اجتماع پر اعتراض کیا تھا۔ جی ہاں ہر ایک کی قسمت کا فیصلہ اس کا آخری انجام کر دیتا ہے، خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے۔

کبھی کبھار دنیا طلبی، مختلف حالات اور دنیا کے رنگ برنگ جلوے انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ بعض شخصیات کے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں کہ انسان، عوام تو عوام خواص کے بارے میں بھی شک و تردید کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے واقعاً یہ بہت سخت دور تھا۔ جن لوگوں نے امیرالمومنین علیہ السلام کا ساتھ دیا اور دشمن کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور دشمن سے جنگ کی تھی انہوں نے واقعاً بہت ہی بصیرت اور سمجھ داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ حضرت امیر علیہ السلام سے ایک روایت ہے۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:(ولا یحمل ھذا العلم الا اہل النصر و الصبر)[1] لہٰذا پہلے مرحلے میں سمجھ داری اور بصیرت کی ضرورت ہے(کیونکہ) ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے غلط رویوں کے مقابلے میں جو اسلام کے دعویدار بھی تھے اور امیرالمومنین علیہ السلام سے جنگ بھی کر رہے تھے اور بے بنیاد اور غلط باتیں بھی کرتے تھے امیرالمومنین علیہ السلام کی مشکلات اور مسائل بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔صدر

[1] ۔ پرچم ولایت اہل بصیرت اور صبر رکھنے والوں کے علاوہ کوئی دوسرا اٹھانے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا۔(نہج البلاغہ، خطبہ، ۱۷۳)

اسلام میں بھی بہت سے غلط افکار زیر بحث لائے جاتے تھے، لیکن ان کے مقابلے میں(فوراً ہی) قرآن کی آیت نازل ہوتی اور ایسے افکار کو واضح طور پر رد کرتی تھی، چاہے وہ مکی دور ہو یا مدنی۔ آپ غور کیجئے کہ سورہ بقرہ جو ایک مدنی سورہ ہے جب انسان اس میں غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زیادہ تر آیات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا یہودیوں اور منافقین کے ساتھ مقابلے اور اسلام کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کی جزئیات تک کو بیان کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس وقت مدینہ کے یہودی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو روحانی اذیت پہنچانے کے لئے جو طریقہ کار اختیار کرتے تھے، قرآن مجید اسے بھی بیان فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:''لَاتَقُولُوا رَاعِنَا''[1] اس طرح کی اور باتوں کو بھی بیان فرماتا ہے۔ مثلا سورہ اعراف ایک مکی سورہ ہے اس میں ایک مفصل گفتگو کرتے ہوئے خرافات اور توہمات سے جنگ کی ترغیب دیتا ہے۔چنانچہ حقیقی محرمات کو گوشت کے انواع و اقسام کے مقابلے میں حلال و حرام قرار دینا اور حقیقی محرمات کو بیکار اور ہیچ سمجھنے پر بات کی گئی ہے۔ (قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا و ما بطن)[2] یہ

---

[1] بقرہ / ۱۰۴ (_ اے ایماندارو تم (رسولؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو تو) ''راعنا'' (ہماری رعایت کیجئے) نہ کہا کرو بلکہ ''انظرنا'' ہم پر توجہ فرمایئے کہا کرو۔)

[2] سورہ اعراف، آیت ۳۳ (_ (اے رسولؐ) تم (صاف) کہدو کہ ہمارے پروردگار نے تو تمام بدکاریوں کو خواہ ظاہری ہو یا باطنی حرام کیا ہے۔)

چیزیں حرام ہیں نہ کہ وہ جسے تم نے اپنے لئے حرام قرار دیا ہے جیسے سائبہ[1]، بحیرہ[2] وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم ایسے افکار کا کھلم کھلا مقابلہ کرتا ہے، لیکن امیرالمومنین علیہ السلام کے دور میں ان کے مخالفین اسی قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن کی انہی آیات باطل مطالب کی تشریح میں پیش کرتے تھے۔ لہٰذا امیرالمومنین علیہ السلام کو بہت سی مشکلات اور مسائل کا سامنا تھا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے مختصر دور حکومت کو اس قسم کے سخت اور مشکل حالات میں گذارا ہے۔ ان لوگوں اور حالات کے مقابلے میں حضرت علی علیہ السلام کا اپنا ایک محاذ تھا جو حقیقت میں ایک مضبوط محاذ تھا جس میں عمّار یاسر، مالک اشتر، عبد اللہ بن عباس، محمد بن ابی بکر، میثم تمّار اور حجر بن عدی جیسے لوگ موجود تھے۔ یہ ایسی مومن، آگاہ اور با بصیرت شخصیات تھیں جو لوگوں کی فکری ہدایت میں بہت اثر و رسوخ رکھتی تھیں اور یہ آپ علیہ السلام کی حکومت کے زمانے کا ایک خوبصورت ترین دور بھی تھا۔ (البتہ یہ خوبصورتی اور حسن انہی بزرگ افراد کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور ایک لحاظ سے ان شخصیات کو جن رنج و آلام اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس لحاظ سے یہ ایک تلخ ترین دور بھی تھا) یہ تاریخ کا وہ منظر ہے کہ ان حضرات نے کوفہ اور بصرہ کا رخ کیا تھا جب طلحہ اور زبیر اور ان جیسے لوگوں نے صف آرائی کرتے ہوئے بصرہ پر قبضہ کر لیا اور وہ کوفہ کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے تو امیر المومنین علیہ السلام نے حضرت امام حسن علیہ السلام اور بعض دیگر اصحاب کو روانہ فرمایا انہوں نے ان لوگوں سے جو مذاکرات کئے،

---

[1] سائبہ اس اونٹنی کا کہا جاتا ہے جسے بتوں سے نذر کر کے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

[2] بحیرہ اس اونٹ کو کہا جاتا ہے جس نے پانچ مرتبہ بچے دئے ہوں جسکا آخری بچہ نر ہو۔

مساجد میں لوگوں کے اجتماعات سے جو خطاب کئے، لوگوں سے مناظرے کئے، وہ سب صدر اسلام کی تاریخ کے پر مغز، حسین و زیبا اور پر جوش آثار شمار ہوتے ہیں۔

آپ ملاحظہ کیجئے کہ امیر المومنین علیہ السلام کے دشمنوں نے جن شخصیات پر سب سے زیادہ حملے کئے ہیں وہ یہی حضرات تھے۔ مالک اشتر، عمّار یاسر، محمد بن ابی بکر کے خلاف سب سے زیادہ سازشوں کے جال بچھائے گئے اور ان تمام لوگوں کے خلاف بھی جو شروع دن سے امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ تھے اور اپنے اخلاص و ایمان اور محبت کا امتحان دے چکے تھے اور اپنی بصیرت اور قوت ایمانی کو عملی طور پر ثابت کر چکے تھے۔ ان کی جانب دشمن کی طرف سے طرح طرح کے بہتانوں اور تہمتوں کے تیر پھینکے جاتے تھے اور دشمن ان کی جان کے درپے تھے اس لئے ان میں سے اکثر لوگ شہید کر دیئے گئے، عمّار یاسر جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ جبکہ مالک اشتر اور محمد بن ابی بکر شامیوں کی سازشوں کے ذریعے شہید ہوئے اور جو حضرات باقی بچے تھے وہ بھی بعد میں انتہائی بے رحمانہ اور سفاکانہ طریقوں سے شہید کر دیئے گئے۔

یہ امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی اور آپ کے طرز حکومت کے متعلق چند باتیں تھیں۔ اگر ہم اس کا خلاصہ کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ علیہ السلام کی حکومت ایک مقتدر، مستحکم اور کامیاب حکومت ہونے کے ساتھ ایک مظلوم حکومت بھی تھی۔ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے زمانے میں دشمنوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا اور اپنی مظلومانہ شہادت کے بعد بھی تاریخ میں ایک مشعل کی طرح ہمیشہ روشن رہے۔ اس دوران آپ علیہ السلام کے دل کو خون کر دینے والے حادثات، آپ علیہ السلام کی محنتیں، مشقتیں اور واقعات بھی تاریخ کا حصّہ ہیں۔

چوتھا باب: حضرت فاطمہ الزہراء (س)

حضرت فاطمہ زہرا (س) کا فیض انسانوں سے بھری اس دنیا کے کسی چھوٹے سے گروہ تک محدود نہیں۔ اگر حقیقت بین اور منطقی نگاہوں سے دیکھا جائے تو پوری انسانیت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی احسان مند نظر آتی ہے اور یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے جیسا کہ پوری انسانیت، اسلام، قرآن، انبیائے الٰہی اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کی مرہون منت ہے اور ہر گذرتے دن کے ساتھ اسلام اور حضرت فا عَلَيْهِ السَّلَامُ کی معنویت کا نور مزید واضح ہوتا جائے گا، اور بشریت اسے بہتر انداز میں محسوس کرے گی۔

ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ خود کو پیغمبر اعظم ﷺ کے خاندان سے منسوب ہونے کے لائق بنائیں۔ البتہ خاندان رسالت، ان کے اعزاء اور ان کی ولایت سے سرشار لوگوں سے منسوب ہونا بہت مشکل کام ہے۔ جیسا کہ ہم زیارت میں پڑھتے ہیں کہ: "ہم آپ کی محبت اور دوستی سے سرشار ہیں"۔ یہ جملہ ہمارے کاندھوں پر عائد ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ خیر کثیر، جس کی خوش خبری خداوند عالم نے سورہ کوثر میں رسول اکرم ﷺ کو دی یعنی ارشاد اقدسِ الٰہی ہے: اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ [1] ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کیا ہے، اس کہ تفسیر حضرت فاطمہ ز عَلَيْهِ السَّلَامُ ہیں۔ دراصل وہ ان تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہیں جو دین محمدی

---

[1] سورہ الکوثر آیت ا۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہِ وَسَلَّم کے آبشاروں سے تمام انسانیت اور تمام خلق خدا کو نصیب ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے ان کمالات کو چھپانے اور ان سے انکار کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے (کیونکہ): وَ اللّٰہ مُتِمّ نورِہِ وَلَو کَرِہَ الکَافِرونَ[1] اور اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا اگرچہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گذرے"۔ ہمیں خود کو اس منبع[2] نور سے قریب کرنا چاہیے اور نور کے مرکز سے قربت کا لازمی نتیجہ، نورانی ہونا ہے۔ ہمیں صرف محبت کے ذریعے ہی نہیں بلکہ عمل سے بھی نورانی ہونا چاہیے۔

یہ وہ عمل ہے جس کا تقاضا محبت، ولایت اور ایمان کرتے ہیں، ہمیں اس عمل کے ذریعے اس خاندان کا حصہ بننا چاہیئے اور اس سے منسوب ہونا چاہیے۔ علیؑ کے گھر کا غلام قنبر بننا آسان کام نہیں ہے۔: سَلمان مِنّا اہل البَیتِ[3] کی منزل تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔

ہم اہل بیت کے پیروکار اور ان سے محبت کرنے والے، ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنوں میں اور ان کے دروازے پر بیٹھنے والوں میں شمار کریں، وہ کہیں کہ فلاں ہمارے در کے خاک نشینوں میں سے ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ اہل بیت ہمارے بارے میں ایسا سوچیں، لیکن یہ کوئی آسان بات نہیں۔ یہ صرف دعویٰ کے بل بوتے سے ملنے والی چیز نہیں اس کے لئے عمل، قربانی، ایثار اور ان کی اطاعت ضروری ہے۔

---

[1] سورہ صف، آیت ۸۔

[2] source

[3] یعنی سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے۔ (الکافی، ج ۲، ص ۲۵۴)

قارئین کرام! ذرا ملاحظہ کیجئے کہ حضرت فا علیہا السلام نے اپنی مختصر زندگی میں بے پناہ فضائل حاصل کئے آپؑ کتنی کم سنی میں اتنی فضیلتوں تک پہنچ گئیں؟ بہت چھوٹی عمر میں، اٹھارہ برس، بیس برس، پچیس برس، روایتیں مختلف ہیں۔ یہ ساری فضیلتیں یوں ہی حاصل نہیں ہوئیں بلکہ: امتحنک اللّٰہ الذی خلقک قبل ان یخلقک فوجدک لما امتحنک صابرۃ [1] خداوند عالم نے حضرت فاطمہ ز علیہا السلام کا امتحان لیا، خداوند عالم کا نظام، حساب کتاب کے ساتھ ہے۔ وہ جو کچھ عطا کرتا ہے حساب سے عطا کرتا ہے۔ اسے اپنی اس خاص کنیز کی قربانیوں اور معرفت کا بخوبی علم تھا اس لئے اللہ نے انہیں اپنے بے پناہ فیض کا سرچشمہ قرار دیا۔

میں نے ایک روایت میں پڑھا ہے کہ حضرت فاطمہ ز علیہا السلام کے نور کی تابانی سے آسمان کے فرشتوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں: زَھَرَ نُورُھَا لِمَلائِکَۃِ السمَاءِ [2] ہم اس چمکتے ہوئے نور سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں؟ ہم اس درخشاں ستارے کے ذریعے اللہ تعالی اور اسکی بندگی کی راہوں کو تلاش کرسکتے ہیں جو صراط مستقیم ہے، جس راستے کو فاطمہ ز علیہا السلام طے کر کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچ چکی ہیں ہم بھی اس راستے کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔

اگر اللہ تعالی نے آپ کے خمیر کو پاک و پاکیزہ قرار دیا ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ یہ عظیم ہستی عالم ناسوت [3] (عالم مادہ) میں بھی امتحان کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے والی ہے۔ اِمتحَنک اللّٰہُ الّذِی خَلَقک قَبلَ ان یَخلُقک فَوَجَدک لِمَا

---

[1] جس خدا نے تجھے خلق کیا ہے اس نے خلق کرنے سے پہلے تجھے آزمایا اور آزمائش میں تجھے کامیاب پایا۔ (روضۃ المتقین فی شرح من لایحضرہ الفقیقہ، ج۵، ص ۳۴۳)

[2] آپ کا نور آسمان کے ملائکہ کے لئے ایسا چمکتا تھا (جیسے ستاروں کی روشنی اہل زمین کے لئے) (بحار الانوار، ج۴۳، ص ۱۷۳)

[3] یعنی ہماری یہ مادی دنیا جو فلسفی اصطلاح میں علم ناسوت یعنی سب سے پست عالم اور وجود کا سب سے کم ترین درجہ ہے۔

اِمتَحنک صَابِرَۃً[1] اصل بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالی کسی خمیر پر اپنا خصوصی لطف و کرم کرتا ہے تو اس لیے کیونکہ وہ اس خمیر کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ امتحان سے کیسے عہدہ بر آں ہونے والا ہے، ورنہ بہت سارے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کا خمیر اچھا تھا، لیکن کیا وہ سب کے سب امتحان الہٰی میں کامیاب ہو گئے؟ حضرت فاطمہ ؑ علیہا السلام کی زندگی کا یہ وہ حصہ ہے کہ ہم اپنی نجات اور بخشش کے لئے جس کے محتاج ہیں۔ شیعہ اسناد سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یَافاطمۃ اعملی فانی لااغنی عنک من اللله شیئا ۔اے میری بیٹی فاطمہ! اللہ کے حکم پر عمل کرو۔ اللہ تعالی کے ہاں میں تمہیں کسی چیز سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔یعنی اپنی آخرت کا بندو بست خود ہی کرو، اور حضرت فا علیہا السلام بچپن سے لیکر اپنی مختصر عمر کے آخر تک اپنی (عاقبت کی) فکر میں رہتی تھی۔ دیکھیے کہ حضرت فاطمہ ؑ علیہا السلام نے بچپن سے لیکر شہادت تک کی اپنی مختصر زندگی کس طرح بسر کی ہے؟

اپنی شادی سے قبل کہ جب آپ ایک چھوٹی سی لڑکی تھیں تو نور و رحمت کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، دنیا ئے نور کو متعارف کرانے والی عظیم شخصیت اور عظیم عالمی انقلاب کے رہبر و منتظم کے ساتھ کہ جن کا انقلاب تا قیامت باقی رہے گا جس دن سے آپ نے پرچم توحید کو بلند کیا، حضرت زہرا علیہا السلام نے ایسا برتاو کیا کہ آپ کی کنیت "اُمّ اَبیھَا' اپنے بابا کی ماں پڑ گئ"۔ یہ ان کی خدمت، کام، محنت و شفقت اور لازوال جدوجہد کی روشن دلیل ہے ورنہ بغیر کسی وجہ کے تو آپ کو "ام ابیھا"[2]

---

[1] التعجب، ص ۹۴۔

[2] کناھاامہ الحسن وامہ الحسین وامہ المحسن وامہ ابیھا: حضرت فاطمہ زہرا کی کنیتیں درج ذیل ہیں: ام الحسن، ام الحسین، ام المحسن، ام ابیھا وغیرہ (بحارالانوار، ۴۳، ص ۱۶)

نہیں کہا گیا، خواہ وہ مکہ کے شب و روز ہوں یا شعب ابی طا عَلَیہِ السَّلام کے اقتصادی اور معاشی حصار[1] کے سخت ترین ایام یا وہ تکلیف دہ وقت جب آپکی والدہ حضرت خا عَلَیہِ السَّلام، حضرت رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کو تنہا چھوڑ گئیں اور پیغمبر اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کے قلب مبارک کو مختصر عرصے میں دو صدمے اٹھانے پڑے، یعنی حضرت خا عَلَیہِ السَّلام اور ابو طا عَلَیہِ السَّلام کی پے درپے وفات۔ ایسے کڑے اور مشکل وقت میں حضرت ؛ عَلَیہِ السَّلام آگے بڑھیں اور اپنے ننھے ہاتھوں سے رسول اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کے چہرہ مبارک پر پڑے ہوئے غم واندوہ کے گرد و غبار کو صاف کیا اور اپنے بابا کی تسلی کا باعث بنیں۔ حضرت ؛ عَلَیہِ السَّلام کی جدوجہد یہاں سے شروع ہوئی۔ ذرا غور کیجیئے حضرت ؛ عَلَیہِ السَّلام کی شخصیت اور جدوجہد کا یہ پہلو کتنا تابناک ہے۔

شعب ابی طالب کے واقعہ میں آپ علیہا السلام کی عمر مبارک ۶ یا سات سال تھی[2] حضرت فاطمہ ؛ عَلَیہِ السَّلام چھ، سات سال کی تھیں ۔ صدر اسلام کی تاریخ میں شعب ابی طالب بے حد سخت اور دشوار دور تھا یعنی پیغمبر اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کی تبلیغ دین شروع ہو چکی تھی، آپؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ[3] اکابرین مکہ بالخصوص نوجوان اور غلام، آپ کی گرویدا ہوتے جا رہے تھے اور بڑے بڑے طاغوت جیسے ابو لہب اور ابو جہل وغیرہ کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پیغمبر اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم اور آپ کے گرد جمع افراد کو مکہ سے باہر نکال دیا جائے۔

---

[1] Social and financial boycott

[2] کیونکہ روایات میں اختلاف ہے

[3] gradually

انہوں نے بعد میں ایسا ہی کیا ان میں سے بہت سے لوگوں کو جن میں در جنوں خاندان، خود پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے قریبی رشتے دار ، یہاں تک کہ حضرت ابو طالبؑ جن کا شمار قریش کے بزرگوں میں ہوتا تھا ان سمیت بہت سے بچے اور بوڑھے شامل تھے ،مکہ سے باہر نکال دیا۔ اب یہ لوگ جاتے تو کہاں جاتے؟ اتفاقاً حضرت ابو طالبؑ کے پاس مکہ کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑی درہ تھا۔ جس کا نام شعب ابی طالب تھا"شعب" پہاڑی درہ کو کہا جاتا ہے۔ فیصلہ ہوا کہ وہیں چلے جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ مکہ میں دن کو دھوپ کی شکل میں آگ برستی تھی لیکن رات کو یخ بستہ سردی پڑتی تھی۔ یعنی موسم ناقابل برداشت تھا۔ ان لوگوں نے اس ویرانے میں تین سال کاٹ دیئے۔ کتنی سختیاں برداشت کیں اور بھوک کی شدت جھیلی ہیں یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کا انتہائی سخت دور یہی تھا۔ اس عرصے میں پیغمبر اسلام کی ذمہ داری صرف لوگوں کی ہدایت ور ہنمائی نہیں تھی بلکہ آپ کو سختیاں جھیلنے والے ان لوگوں کے سامنے بھی اپنے مشن کا دفاع کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں جب حالات صحیح ہوتے ہیں تو وہ لوگ جو کسی رہبر اور رہنما کا ساتھ دیتے ہیں وہ سب حالات سے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ تعالی ان کو خوش رکھے انہوں نے ہماری حالت بدل کر رکھ دی، لیکن جب کوئی مشکل وقت آ جاتا ہیں تو سب تذبذب[1] کا شکار ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: اس نے ہمیں پھنسا دیا ہے۔ ہم تو ان مسائل میں الجھنا ہی نہیں چاہتے تھے! لیکن جن لوگوں کا ایمان مضبوط ہوتا ہے وہ ان مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ آخر کار ان تمام سختیوں کا بوجھ پیغمبر اسلام ﷺ کے کاندھوں پر پڑا۔

---

[1] doubts

انہی دنوں جب پیغمبر اسلام ﷺ انتہائی سخت حالات سے دوچار تھے حضرت ابو طالبؑ، جو پیغمبر اکرم ﷺ کے مددگار تھے اور ان سے آپ کو امیدیں وابستہ تھیں، اسی طرح حضرت خدیجہ کبریٰؑ جو پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک اور بہت بڑی مددگار تھیں چند دن کے اندر یہ دونوں ہستیاں دنیا سے رخصت ہو گئیں! یہ بڑا عجیب سانحہ تھا، یعنی پیغمبر اسلام بالکل بے سہارا اور تنہا ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کبھی کسی گروہ یا تنظیم[1] کے سربراہ کے طور پر کام کیا ہے یا نہیں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ ایک گروہ کی قیادت کتنا مشکل کام ہے؟ ایسے حالات میں واقعاً انسان لاچار ہو جاتا ہے۔ اب آپ ان حالات میں جناب فاطمہ علیہا السلام کے کردار کو دیکھ لیجئے۔ جب انسان تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اس قسم کی باتوں کو حاشیہ میں دیکھ لیتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑھتا ہے کہ تاریخ میں اس حوالے سے کوئی الگ باب نہیں کھولا گیا ہے۔ فاطمہ علیہا السلام نے پیغمبر اسلام کے لئے ماں، ایک مشیر اور ایک جانثار کا کردار ادا کیا، یہی وجہ تھی کہ حضرت فاطمہ زہرا کے لئے "ام ابیہا" یعنی اپنے باپ کی ماں کہا گیا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ چھ، سات سال کی ایک بچی تھیں۔ البتہ یہ بات بھی ہے کہ عرب ماحول اور گرم علاقوں میں لڑکیوں کی جسمانی اور ذہنی نشو نما[2] تیزی سے ہوتی ہے اس لحاظ سے آپ آج کی دس بارہ سالہ لڑکی کے برابر رہی ہونگی۔ یہ احساس ذمہ داری اور فرض شناسی[3] ہے۔ کیا ایک نوجوان لڑکی کی یہ بات نمونہ عمل نہیں کہ وہ اپنے اردگرد کے مسائل کے بارے میں اتنی جلدی اپنی ذمہ داری کا احساس کرے؟ اور اپنے وجود میں پنہاں جوش و نشاط کے اس

---

[1] organization

[2] growth

[3] Sense of responsibility and duty

خزانے کو بروئے کار لاتے ہوئے باپ کے چہرے سے جو اس وقت غالباً پچاس سال کا ہو چکا ہے اور بڑھاپے کی سمت گامزن ہے غم و غصے کے غبار کو جھاڑے، کیا یہ ایک نوجوان لڑکی کا بہترین نمونہ عمل نہیں ہے؟ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔

اس زمانے میں اور ایسے ماحول میں پیغمبر اسلام نے ایک ایسی بیٹی کہ تربیت کی کہ یہ بیٹی لیاقت و شائستگی کی اس منزل پر پہنچ گئی کہ خدا کا رسول ﷺ اس کے ہاتھوں کے بوسے لیتا ہے حضرت فاطمہ عَلَیہَا السّلَام کے ہاتھوں پر پیغمبر اکرم ﷺ کے بوسے کو جذباتی معاملے پر ہر گز محمول نہ کیجئے گا۔ یہ سوچنا کہ چونکہ وہ آپؐ کی بیٹی تھیں اور آپ ؐ کو ان سے بڑی محبت تھی لہٰذا صرف اسی وجہ آپ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے تھے، بالکل غلط اور سطحی فکر ہے۔ اس بے مثال اور گراں قدر شخصیت کے مالک اور زیور عدل و حکمت سے آراستہ اسلام کے پیغمبر ﷺ کے لئے جن کے افعال و اقوال کا دار و مدار وحی الٰہی اور الہام پر ہے، بھلا کیسے ممکن ہے کہ وہ جھکے اور اپنی بیٹی کے ہاتھ چومے؟ یہ نہیں ہو سکتا، یہاں معاملہ کچھ اور ہے، یہ ماجرا ہی کچھ اور ہے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ بیٹی اور یہ جوان خاتون جس کی عمر دنیا سے رخصت کے وقت اٹھارہ سے پچیس سال کے درمیان رہی ہے، در حقیقت انسانیت کی ملکوتی بلندیوں پر فائز اور ایک غیر معمولی ہستی کی مالک تھی۔ عورت کے بارے میں اسلام کا یہی نظریہ ہے۔ لیکن اس عظیم شخصیت کا روحانی اور معنوی مقام اس کے جہادی، انقلابی اور اجتماعی مقام سے کہیں بلند ہے۔

فاطمہ زہرا عَلَیہَا السّلَام ظاہراً ایک عام انسان اور عورت اور وہ بھی ایک نوجوان خاتون ہیں لیکن معنوی اعتبار سے ایک عظیم حقیقت، چمکتا ہو الٰہی نور، ایک صالح ہستی، ایک ممتاز اور منتخبِ روز گار انسان ہیں۔ یہ وہ عظیم شخصیت ہے کے جس کے بارے میں پیغمبر اسلام نے امیر المومنین عَلَیہِ السّلَام سے فرمایا تھا: یا علی انت امامہ امتی وخلیفتی علیھا بعدی وانت قائد المومنین الی

الجنۃ وکانی انظر الی ابنتی فاطمۃ قد اقبلت یوم القیامۃ علی نجیب من نور عن یمینھا سبعون الف ملکاً تقود مومنات امتی الی الجنۃ [1]

یعنی قیامت کے دن امیر المومنین امام عَلَیہِ السَّلام مومن مردوں اور حضرت فاطمہ زہرا عَلَیہَا السَّلام مؤمن عورتوں کی جنت کی طرف رہنمائی فرمائیں گی۔ آپ کی شخصیت امیر المو عَلَیہِ السَّلام کے برابر ہے۔ یہ وہ عظیم شخصیت ہے کہ جب محراب عبادت میں کھڑی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالی کے ہزاروں مقرب فرشتے آپؑ سے مخاطب ہوتے اور آپ ؑکو سلام کرتے ہیں اور آپؑ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے وہی الفاظ دہراتے ہیں جو ان سے پہلے حضرت عَلَیہَا السَّلام کے بارے میں کہا کرتے تھے: یافاطمۃ ان اللہ اصطفاک وطھرک واصطفاک علی نساء العالمین [2]۔ یہ ہے حضرت ف عَلَیہَا السَّلام کا روحانی اور معنوی مقام و مرتبہ۔ ایک عورت اور وہ بھی نوجوانی میں ہی روحانی اور معنوی لحاظ سے اس مقام تک پہنچی کہ بعض روایتوں کے مطابق اللہ کے مقرب فرشتے آپؑ سے ہم کلام ہوتے ہیں اور آپؑ کے سامنے کائنات کے حقائق کو پیش کرتے ہیں اسی لیے تو آپ کو "محدثہ" کہا جاتا ہے، یعنی وہ شخصیت کہ جس کے ساتھ فرشتے گفتگو

[1] اے علی! تم اس امت کے امام اور میرے بعد ان کے خلیفہ ہو اور مومنین کی بہشت کی طرف رہنمائی کرنے والے ہو گویا میں دیکھ رہا ہو کہ میری بیٹی فاطمہ قیامت کے دن ایک نورانی اونٹ پر سوار ہے اور آپ کے دائیں، بائیں اور آگے اور پیچھے ستر ہزار فرشتے کھڑے ہیں اور وہ میری امت کی مومن عورتوں کی بہشت کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ (بحار الانوار، ج۴۳، ص۲۴)

[2] اے فاطمہ! اللہ تعالی نے تجھے منتخب فرمایا ہے، اور ہر قسم کی نجاستوں سے پاک کیا ہے اور تجھے عالمین کی عورتوں پر فضیلت عطا کی ہے۔ (بحار الانوار، ج۴۳، ص۲۴)

کرتے ہیں۔ یہ دنیا کی دوسری تمام عورتوں کے مقابلے میں حضرت فا علیہا السلام کا معنوی مقام اور برتری ہے۔

حضرت فاطمہ علیہا السلام کمالات کی اس بلندی پر فائز ہو کر دنیا کی ساری خواتین سے مخاطب ہوتی ہیں اور انہیں اس راستے پر چلنے کہ دعوت دیتی ہیں۔ تاریخ میں جن لوگوں نے چاہے ان کا تعلق قدیم جاہلیت سے یا ہو بیسویں صدی کہ جدید جاہلیت سے، یہ کوشش کی کہ عورت کی تذلیل و تحقیر کی جائے اور اسے ظاہری زینت کا خوگر بنا کر پیش کیا جائے اور اسے لباس کے فیشن، سونے چاندی کا گرویدہ اور میک اپ کا دلدادہ ظاہر کریں اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا سامان بنا کے پیش کریں اور وہ خود بھی عملی طور پر اسی طرز کو اپناتے ہیں۔ ان کی یہ بے تکی منطق اور سطحی سوچ حضرت فاطمہ علیہا السلام کی درخشاں اور سورج کی طرح چمکتی شخصیت کے سامنے برف کی طرح پگھل کر نابود ہو جاتی ہے۔ اسلام حضرت فاطمہ علیہا السلام جیسی عظیم اور ملکوتی ہستی کو دنیا کی تمام عورتوں کے لئے نمونہ عمل[1] کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

ان کی ظاہری زندگی، جہاد، علم ودانش، زوربیان، فداکاری، شوہر کی خدمت ، ماں کا کردار، بیوی کی حیثیت، ہجرت اور تمام سیاسی، انتظامی اور انقلابی میدانوں میں کردار ادا کرتے گذری۔ اس جاں فشانی سے ایسے حالات کا مقابلہ تو بڑے اور نامور مرد حضرات بھی نہیں کر پاتے۔ آپؑ کا یہ معنوی مقام، رکوع، سجود، عبادت، دعا، تلاوت، تضرع و زاری، ملکوتی ذات اور معنویت بھری زندگی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور

---

[1] Role model

امیر المو‌ٔ عَلَیہِ السَّلام کے ہم پایہ اور مساوی ہونے کی بہترین دلیل ہیں۔ اسلام عورت کو جس مقام کا حامل دیکھنا چاہتا ہے، اس کے لئے حقیقی نمونہ یہی خاتون ہیں جسے فاطمہ عَلَیہِ السَّلام کہا جاتا ہے۔

فاطمہ عَلَیہِ السَّلام کی زندگی میں ایک خاص نکتہ پایا جاتا ہے جس پر توجہ دینا بہت ضروری ہے اگرچہ ہم اس عظیم شخصیت کے معنوی اور روحانی مقام کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے اور نہ ہی ہمارے اندر فاطمہ عَلَیہِ السَّلام کے معنوی اور روحانی مقام و منزلت کو سمجھنے کی قابلیت ہے۔ انسانی اقدار کی بلند ترین چوٹی پر فائز اس عظیم شخصیت کی منزلت کو اللہ جانتا ہے یا وہ ہستیاں جانتی ہیں جو مقام ومرتبہ کے لحاظ سے خود اس شخصیت کی برابر ہوں۔ لہٰذا فاطمہ عَلَیہِ السَّلام کے مقام و مرتبہ کو آپؑ کے والد بزرگوار یا شوہر نامدار یا آپؑ کی معصوم اولاد سمجھ سکتے ہیں۔اس زمانے کے لوگ ہوں یا اس کے بعد سے لے کر آج کے لوگ، ان میں اس عظیم الشان روحانی اور معنوی شخصیت کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔ آپ کی معنویت کا نور کو ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی، خصوصاً وہ آنکھ جو کمزور ہواور نزدیک کی چیزوں کو دیکھنے کی عادی ہو اس میں اس عظیم الشان شخصیت میں موجود اعلیٰ انسانی اقدار کے جلووں کو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی۔لہٰذا ہم فاطمہ عَلَیہِ السَّلام کے معنوی اور روحانی مقام کو بیان کرنے نہیں جا رہے ہیں ۔لیکن اس عظیم الشان شخصیت کی عام زندگی میں ایک اہم نکتہ جو پایا جاتا ہے وہ مختلف پہلوؤں کا آپ کی شخصیت میں جمع ہونا ہے۔ ایک مسلمان عورت کی طرح اپنے شوہر کی خدمت، اپنے بچوں کی پرورش اور گھر کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ کبھی نہ تھکنے والے ایک غیور مجاہد کی طرح اہم سیاسی

مسائل سے نبرد آزما ہونا، اپنے والد بزرگوار کی رحلت کے بعد مسجد نبوی میں تشریف لا کر خطبہ دینا اور اپنے موقف[1] کا مسلسل دفاع کرنا ہے۔ یہ کردار ہر لحاظ سے ایک جہاد، عظیم الشان جدوجہد اور مشکلات اور سختیوں کو جھیلنے کا تقا ضا کرتا ہے۔ دوسری طرف آپ کی عبادت ، رات کی تاریکی میں محراب عبادت میں کھڑے ہو کر پڑھی جانے والی نمازیں، اپنے رب سے راز و نیاز اور اللہ تعالی کی حضور آپ کا خشوع وخضوع بھی اپنی مثال آپ ہے۔ آپ عظیم اولیاء اللہ کی طرح اپنے رب سے راز و نیاز اور اسکی عبادت کیا کرتی تھیں۔

فاطمہ ؛ عَلَيْهَا السَّلَام کی زندگی کا روشن ترین نکتہ یہ ہے کہ آپؑ کی زندگی میں یہ تینوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ آپؑ نے ان تینوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں جو شخص عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں وہ بس ایک عابد، دعا اور ذکر کا عادی ہو سکتا ہے، وہ ایک سیاسی انسان نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو سیاستدان ہے چاہے (عورت ہو یا مرد) اور جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں پیش پیش ہے، وہ اگر عورت ہے تو پھر ایک گھریلو خاتون، ایک بہترین ماں اور ایک بہترین بیوی کا کردار ادا نہیں کر سکتی، اور اگر وہ مرد ہے تو گھریلو مرد کی طرح کام کاج، دکانداری وغیرہ نہیں کر سکتا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں یہ تینوں پہلو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کی ضد نہیں، بلکہ ایک انسان کامل کی شخصیت کی تکمیل میں مددگار ہیں۔

---

[1] stand

حضرت فاطمہ علیہا السلام کی شخصیت تمام پہلووں یعنی سیاسی، اجتماعی اور جہادی اعتبار سے ممتاز اور نمایاں ہے۔ دنیا بھر کی بر سر پیکار اور انقلابی خواتین آپ کی مختصر اور پر مغز زندگی سے درس حاصل کر سکتی ہیں۔ ایک خاتون جس نے انقلاب کے گھرانے میں آنکھ کھولی اور اپنا پورا بچپن ایک ایسے باپ کی آغوش میں گزارا ہو جس کی پوری زندگی ناقابل فراموش اور عظیم الشان جدوجہد سے عبارت تھی۔ وہ معظمہ جو اپنے بچپن میں مکی دور کی سختیوں کو جھیل چکی ہو، جسے شعب ابی طالب جانا پڑا ہو، جس نے وہاں بھوک اور پیاس کی سختیوں کو برداشت کیا ہو اور مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ایک ایسے شخص کی شریک حیات بنی ہو کہ جس کی پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں گذری ہو۔ فاطمہ علیہا السلام اور امیر المومنین امام علیہ السلام کی مشترکہ زندگی کے تقریباً گیارہ سالوں میں کوئی ایک سال یا چھ مہینے ایسے نہیں گزرے ہونگے کہ جب آپ کے شوہر نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے کمر نہ کسی ہو اور میدان جنگ میں نہ گئے ہوں اور اس عظیم اور فداکار خاتون نے ایک مرد مجاہد اور ایک فوجی کمانڈر کی شریک حیات کی حیثیت سے ان کی شایان شان خدمت نہ کی ہو۔

اگرچہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کی زندگی مختصر تھی جو تقریباً بیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن آپؑ کی اس زندگی میں جہاد، مبارزہ، جدوجہد، صبر و استقامت، درس و تدریس، نبوت، امامت اور نظام اسلامی کے دفاع میں تقاریر کا ایک عظیم سمندر پایا جاتا ہے اور اس کا آخری نتیجہ شہادت کی صورت میں نکلا۔ یہ ہے جناب فاطمہ علیہا السلام کی مجاہدانہ زندگی جو عظیم الشان اور

غیر معمولی حد تک بے نظیر و بے مثال ہے، اور یقیناً ہر انسان (چاہے آج کا انسان ہو یا آئندہ کا) کے ذہن میں ایک روشن اور استثنائی[1] مثال بن کے چمکتی رہے گی۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام علم کے میدان میں بھی ایک عظیم عالمہ تھیں۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد آپؑ نے مسجد نبوی میں جو تاریخی خطبہ دیا، مرحوم علامہ مجلسی کے بقول تمام ادباء، فصحاء اور علماء کو چاہیے کہ وہ مل بیٹھ کر آپؑ کے اس خطبے کے ایک ایک لفظ کی تفسیر کو بیان کریں، کیونکہ آپ کا یہ خطبہ اتنا پر مغز اور فصیح و بلیغ ہے کہ ادبی لحاظ سے نہج البلاغہ کے فصیح اور بلیغ ترین خطبوں کی طرح ہے۔

رحلت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد فاطمہ زہرا علیہا السلام مسجد نبوی میں گئیں اور لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر فی البدیہہ[2] خطبہ ارشاد فرمایا!۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک خوبصورت اور فصیح و بلیغ اور منتخب لفظوں پر مشتمل یہ خطبہ ایک ادبی شاہکار اور اسلام کا سرمایہ ہے۔

بنیادی طور پر ہم جیسے لوگ جو مقرر ہیں اور فی البدیہہ تقریریں کرتے ہیں ، سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی یہ تقریر کتنی عظیم ہے۔ ایک اٹھارہ، بیس، یا زیادہ سے زیادہ چوبیس سالہ لڑکی (کیونکہ آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف کی وجہ سے آپ کی صحیح عمر معلوم نہیں ہے) اتنی مشکلات اور سختیوں کے باوجود مسجد چلی آئے اور لوگوں کے جمع غفیر کے سامنے پورے اسلامی حجاب میں ملبوس ہو کر ایک ایسا تاریخی خطبہ بیان کرے کہ اس کا ایک ایک لفظ تاریخ میں محفوظ ہو جائے۔

---

[1] Exceptional

[2] extempore

عرب کے لوگ اپنے حافظے[1] کی وجہ سے مشہور تھے۔ وہاں ایک شخص جب کسی محفل میں آکر ۸۰ مصرعوں پر مشتمل ایک قصیدہ پڑھتا تو محفل کے اختتام پر دس لوگ بیٹھ کر اس قصیدے کو لکھتے تھے۔ اس دور کے جو قصائد آج بھی باقی ہیں وہ غالباً اسی طرح محفوظ رہے ہیں۔ وہ اشعار جو اجتماعی مراکز میں پڑھے جاتے تھے انہیں محفوظ کیا جاتا تھا۔ معصومین کی احادیث اسی طرح محفوظ کی گئی ہیں، لوگوں نے بیٹھ کر انہیں لکھا ہے اور حفظ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ خطبے آج تک باقی ہیں۔

بے کار اور فضول باتیں تاریخ میں باقی نہیں رہتی ہیں (آپ سوچیں کہ) اب تک طول تاریخ میں کتنی باتیں کی گئی ہونگی، کتنی تقریریں کی گئی ہونگی، کتنے مطالب بیان کئے گئے ہونگے اور کتنے اشعار کہے گئے ہونگے لیکن سب باقی نہیں رہے، اور کسی کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن جس چیز کو تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کیا ہے اور چودہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی جو شخص اسے دیکھتا ہے وہ اپنے دل میں عظمت کا احساس کرتا ہے یہ خود ان کی عظمت کی علامت ہے۔

حضرت فاطمہ علیہا السلام کی زندگی کا ہر پہلو اعلیٰ انسانی اقدار کی تلاش اور جستجو سے عبارت ہے۔ آپ کے شوہر نامدار محاذ جنگ کو سنبھالے ہوئے ہیں، لیکن ان تمام مشکلوں کے باوجود آپ کا گھر تمام انسانوں کے لئے ایک درس گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشکل کشا بیٹی تھیں۔ آپؑ نے ان مشکل حالات میں بھی کمال سر فرازی کے ساتھ زندگی گزاری ہے آپؑ نے حسنینؑ اور حضرت زینبؑ جیسی اولاد کی تربیت کی، امام علیؑ جیسے شوہر کا خیال رکھا اور

Memory [1]

پیغمبر اسلام ﷺ جیسے باپ کی خوشنودی کو بھی ملحوظ رکھا! اور جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہو اور مال غنیمت کے دروازے کھل گئے تو پیغمبر اسلام ﷺ کی اس بیٹی نے دنیاوی لذتوں، عیش و عشرت اور اس قسم کی چیزوں کی طرف کہ جن کی عام طور پر جوان لڑکیاں اور عورتیں متوجہ ہوتی ہیں، کبھی بھی توجہ نہیں دی۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی عبادت بھی ایک نمونہ ہے۔ حسن بصری جسکا شمار عالم اسلام کے ممتاز عابدوں اور زاہدوں میں ہوتا ہے کہتا ہے: پیغمبر اسلام ﷺ کی بیٹی اتنی عبادت کیا کرتی اور محراب عبادت میں کھڑی رہتی تھیں کہ تورمت قدماها[1] محراب عبادت میں زیادہ دیر کھڑا رہنے کی وجہ سے آپ کے پاوں میں ورم آگیا تھا! حضرت امام حسن مجتبیٰؑ فرماتے ہیں ایک رات (شب جمعہ) میری مادر گرامی عبادت میں مشغول ہو گئیں اور صبح تک عبادت کرتی رہیں۔ "حتیٰ انفجرت عمود الصبح" یہاں تک کہ سپیدہ سحری نمودار ہوا۔ روایت کے مطابق امام حسنؑ فرماتے ہیں: میں پوری رات سنتا رہا میری والدہ تمام مومنین و مومنات، مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے عمومی مسائل کے حل کے لئے دعا کرتی رہیں اور جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا: "یا اماہ! لم لا تدعین لنفسک کما تدعین لغیرک"۔ مادر گرامی! پوری رات جس طرح دوسروں کے لئے دعا کرتی رہیں اسی طرح اپنے لئے دعا کیوں نہیں کی؟! آپ نے فرمایا: یابنی الجار ثم الدار[2] بیٹے پہلے پڑوسی پھر گھر۔ یعنی پہلے دوسروں کا خیال ضروری ہے پھر اپنے لئے! یہ ہے آپ کی اعلیٰ سوچ۔

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب، ج۳، ص ۳۴۱۔

[2] بحارالانوار، ج۴۳، ص ۸۱-۸۲

زندگی کے تمام شعبوں میں اس عظیم خاتون کا جہاد ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے چاہے آپ کا جہاد اسلام کے دفاع میں ہو یا امامت اور ولایت کے دفاع میں یا پیغمبر اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی حمایت میں ہو یا اپنے شوہر اور افواج اسلامی کے علمدار علی ابن ابی طالبؑ کی دیکھ بھال کے سلسلے میں۔ یہی وجہ ہیں کہ امیر المومنین عَلَیْہِ السَّلَام جناب فاطمہ زہرا عَلَیْہَا السَّلَام کے بارے میں فرماتے ہیں:ولا اغضبتی ولا عصت لی امرا یعنی پوری ازدواجی زندگی کے دوران فاطمہؑ نے ایک مرتبہ بھی مجھے ناراض نہیں کیا اور نہ کبھی میرے حکم کی نافرمانی کی۔ حضرت فاطمہ زہرا عَلَیْہَا السَّلَام اپنی تمام تر عظمت اور بزرگی کے باوجود اپنی گھریلو زندگی کو ایک بیوی اور شریک حیات کی حیثیت سے اس طرح گزارا ہے جیسے اسلام کا حکم ہے۔

آپؑ کی عبادت، فصاحت وبلاغت، علم و فراست، معرفت و حکمت، جہاد اور جدوجہد، ایک لڑکی کی حیثیت سے آپؑ کا کردار، ایک بیوی کی حیثیت سے آپ کا طرز زندگی، ایک ماں کی حیثیت سے آپ کا کردار، غریبوں اور مسکینوں پر آپکا احسان ایک مسلمان عورت کے لئے مکمل نمونہ عمل ہے۔ پیغمبر اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ایک ضعیف عمر غریب شخص کو یہ کہہ کر امیر المومنینؑ کے دروازے پر بھیجا کہ جاکر اس در سے مانگو اور جب وہ ضعیف شخص امیر المومنینؑ کے دروازے پر آیا تو آپ کے گھر میں اسے دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ حضرت فاطمہ زہرا عَلَیْہَا السَّلَام نے ایک کھال کہ جس پر امام حسنؑ اور امام حسینؑ سویا کرتے تھے، اٹھا کر اس شخص کو دی اور کہا کہ جاو اس کو فروخت کر کے اپنی ضرورت پوری کرو۔ یہ ہے جناب فاطمہ زہرا عَلَیْہَا السَّلَام کی ہمہ گیر شخصیت، جو مکمل نمونہ عمل ہے۔

ایک مسلمان عورت کو ہمیشہ علم و فراست کی جستجو میں رہنا چاہیے، روحانی اور اخلاقی حوالے سے خود سازی میں کوشاں رہنا چاہیے، اسے ہر قسم کے میدان جہاد میں آگے آگے ہونا چاہیے، دنیا

کی پر کشش لیکن بے قیمت اور پر تکلف چیزوں سے لا پروائی برتنی چاہیے، عصمت و طہارت کے اس درجہ پر فائز ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اسے بری نظروں سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے، گھر کی چار دیواری میں اپنے شوہر اور بچوں کے اطمینان قلب کا باعث بنے، اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے باعث سکون ہو اور اپنے پیار اور محبت بھرے دامن اور اپنی باتوں کے ذریعے ایسے بچوں کی تربیت کرے جو روحانی اور نفسیاتی لحاظ سے صحیح و سالم اور پر نشاط ہوں اور معاشرے کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔

سارے معماروں میں سب سے اعلیٰ اور بہترین معمار ماں ہے۔ ممکن ہے دنیا کے بڑے سے بڑے سائنسدان مل کر کوئی ایسا پیچیدہ قسم کا کوئی الیکٹرونک آلہ ایجاد کریں، براعظموں[1] کو نشانا بنانے والے میزائل بنائیں یا فضا کو تسخیر کرنے والے آلات ایجاد کریں لیکن ان میں سے کسی کو بھی وہ اہمیت حاصل نہیں کہ جو ایک اعلیٰ صفات کے حامل انسان بنانے والی شخصیت کی ہے، اور یہ کام صرف اور صرف ایک ماں انجام دے سکتی ہے۔ اس لئے خاتون جنت ایک مسلمان عورت کے لئے کامل نمونہ ہے۔

---

[1] conitnents

پانچواں باب: حضرت امام حسن علیہ السلام

حضرت امام حسن مجتبیٰ ؑ کا دور خلافت اور آپ کا معاویہ کے ساتھ صلح کرنا یا وہ واقعہ جسے صلح کا نام دیا گیا ہے، تاریخ اسلام کے صدر اول کے اسلامی اور انقلابی طریقہ کار میں ایک بے مثال اور اسلام کی تقدیر بدل کر رکھ دینے والا واقعہ ہے۔ ہمارے نزدیک اس واقعہ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ میں یہاں مختصر وضاحت کے بعد اصل مطلب کی طرف آوں گا۔ اسلامی انقلاب یعنی اسلامی آئیڈیلوجی [1]، وہ امانت جسے اسلام کے نام سے لوگوں کے لئے بھیجا تھا جو ابتدائی طور پر ایک تحریک تھی یعنی اس دین نے کہ جس نے ابتداء میں اپنے آپ کو جہاد اور ایک عظیم انقلابی تحریک کی صورت میں پیش کیا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ میں اس نظریے کا اعلان کر دیا تھا اور توحید اور اسلام کے دشمنوں نے اس کے مقابلے میں صف آرائی کی تھی تاکہ اس فکر کو آگے بڑھنے سے روکا جاسکے لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے با وفا اصحاب کی مدد سے اس تحریک کو منظم کیا اور سرزمین مکہ میں عاقلانہ اور قوی تحریک کا آغاز کیا اور یہ تحریک مسلسل تیرہ سال تک جاری رہی یہ اس کا پہلا دور تھا۔

تیرہ سال بعد آپ ؐ نے اپنی تعلیمات، شعار، تنظیم سازی اور بے پناہ قربانیوں اور دیگر ذرائع کی مدد سے اس فکر کو ایک حکومت اور ایک سیاسی نظام اور ایک امت کی زندگی کے اجتماعی نظام سے بدل دیا اور یہ سب اس وقت ہوا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور اسے

---

[1] Islamic ideology

اپنی حکومت کا مرکز قرار دیا پھر وہیں سے اسلامی تعلیمات کو عام کرتے رہے، اسلام ایک تحریک سے نکل کر ایک حکومت میں تبدیل ہو گیا، یہ دوسرا دور تھا۔

۔یہ طریقہ کار پیغمبر اکرم ﷺ کے دس سالہ دور اقتدار میں اور آپ کے بعد چار خلفاء اور امام حسن مجتبیٰؑ کے چھ مہینے کے دور خلافت تک جاری رہا اور ایک اسلامی نظام حکومت کی صورت میں ظاہر ہوا جہاں ہر شعبے کے لئے ایک اجتماعی نظام موجود تھا یعنی حکومتی، فوجی، سیاسی، ثقافتی، عدالتی اور اقتصادی امور کے شعبے موجود تھے جو اب ترقی کی راہ پر گامزن تھے۔ اگر اس رفتار سے نظام آگے بڑھتا چلا جاتا تو پورے عالم پر چھا جاتا یعنی اسلام نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کے اندر یہ قابلیت موجود ہے ۔ امام حسن مجتبیٰؑ کے دور خلافت میں (اسلام) مخالف تحریکوں نے یوں سر اٹھایا کہ وہ اسلامی نظام کی راہ میں ایک رکاوٹ بن کر سامنے آنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اگر چہ یہ تحریکیں امام حسنؑ کے دور میں وجود نہیں آئی تھیں بلکہ یہ بہت سال پہلے سے موجود تھیں۔ اگر کوئی شخص اپنے اعتقادی نظریات سے ذرا ہٹ کر صرف تاریخی حقائق[1] کی روشنی میں بات کرے تو یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ تحریکیں اسلام کے ساتھ ہی وجود میں آئی تھیں اور یہ اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں جو نبوی تحریک یعنی مکی دور میں بھی موجود تھیں۔ حضرت عثمان کے دور میں جب خلافت بنو امیہ کے پاس آگئی تو ابو سفیان نے (جو اس وقت نابینا ہو چکا تھا اور اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ ایک محفل میں بیٹھا ہوا تھا) پوچھا: یہاں پر کون لوگ موجود ہیں؟ جب اسے بتایا گیا کہ فلاں فلاں ہیں اور جب اسے یقین ہو گیا کے سب بنو امیہ کے ہی لوگ ہیں اور

---

[1] Historical fact

کوئی غیر موجود نہیں تو اس نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: تلقفوھا تلقف الکرۃ[1] یعنی گیند کی طرح حکومت کو ایک دوسرے کے حوالے کرتے جاو اور اپنے ہاتھ سے نکلنے نہ دو! اس واقعہ کو سنی شیعہ دونوں کی تاریخی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ کوئی اعتقادی مسائل نہیں ہیں اور نہ ہی ہم اعتقادی مسائل پر بات کر رہے ہیں بلکہ میں صرف اس واقعہ کا تاریخی پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں البتہ ابو سفیان اس وقت ایمان لا چکا تھا اور وہ مسلمان تھا لیکن وہ اسلام کی قدرت کے وقت اسلام لایا تھا نہ اسلام کی غربت اور مشکلات کے وقت یہ تحریک حضرت امام حسنؑ کے دور خلافت میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور یہ وہ تحریک تھی جو معاویہ بن ابی سفیان کی شکل میں امام حسن مجتبیٰؑ کے سامنے ظاہر ہو گئی۔ اس تحریک نے اسلامی نظام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دی یعنی حکومت اسلامی کا راستہ روکتے ہوئے اسکے جڑوں کو کاٹ دیا اور اس کے لئے مشکلات کھڑی کر دیں۔ یہاں تک کہ عملی طور پر اسلامی حکومت کی ترقی اور ارتقاء میں رکاوٹ بن گئی۔ صلح امام حسنؑ کے باب میں ہم نے بار بار اس مسئلے کو بیان کیا ہے اور کتابوں میں بھی لکھا ہوا ہے کہ اگر اس موقع پر امام حسنؑ کی جگہ کوئی اور ہوتا یہاں تک کہ خود امیر المومنین امام علیؑ ہوتے تب بھی جو کچھ امام حسنؑ نے کیا تھا اس کے علاوہ کچھ اور ممکن ہی نہ تھا۔ کوئی بھی شخص امام حسنؑ کے اس اقدام کے کسی گوشے پر انگلی نہیں اٹھا سکتا کیونکہ آپ کا یہ اقدام سو فیصد منطقی استدلال پر مبنی ہے۔

اہل بیت علیہم السلام میں سب سے زیادہ انقلابی کون تھا؟ کس کی زندگی جدوجہد اور جہاد میں گذری ہے؟ دشمن کے مقابلے میں اپنی دینی غیرت اور حمیت کا پاس رکھنے والا کون تھا؟ (یقیناً) حسین

---

[1] الاحتجاج علی اہل اللجاج، طبرسی، ج ۱، ص ۲۳۴

ابن علیؑ تھے۔ اور آپ صلح میں امام حسنؑ کے برابر کے شریک تھے۔ امام حسنؑ نے اکیلے صلح نہیں کی تھی، بلکہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں نے ملکر صلح کی تھی۔، فرق صرف یہ تھا کہ امام حسنؑ آگے آگے تھے اور امام حسینؑ آپ کے پیچھے تھے اور امام حسنؑ کے نظریات کا دفاع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک نشست میں جب آپ کے قریبی دوستوں (تحریکی اور انقلابی ساتھیوں) میں سے ایک شخص نے امام حسنؑ پر اعتراض کیا تو امام حسینؑ نے امام حسنؑ کا دفاع کیا۔ وغمز الحسین حجرا[1] کوئی شخص یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ امام حسنؑ کی جگہ امام حسینؑ ہوتے تو یہ صلح واقع نہ ہوتی بلکہ اس صلح میں بھی امام حسین، امام حسنؑ کے ہمراہ موجود تھے اور صلح واقع ہوئی اسی طرح اگر امام حسینؑ اکیلے ہوتے تب بھی ایسے حالات میں وہی کچھ کرتے جو امام حسنؑ نے کیا۔

تاریخ کا باعظمت اور شائستگی سے بھرپور مصلحانہ اقدام

صلح کی تمام شرائط موجود تھیں اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا کیونکہ اس وقت شہادت کے لئے خود کو پیش کرنے کا موقع ہرگز نہیں تھا۔ جیسا کہ مرحوم شیخ آل یاسین نے اپنی کتاب "صلح امام حسنؑ" جس کا میں نے ۱۹۶۹ء میں فارسی میں ترجمہ کیا تھا، میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس وقت شہادت کا امکان ہی نہ تھا کیونکہ ہر مقتول شہید نہیں کہلاتا بلکہ کچھ شرائط کے ساتھ اگر کوئی مارا جائے تو اسے شہید کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ شرائط یہاں موجود نہیں تھیں لہٰذا اگر امام حسنؑ ان دنوں قتل ہو جاتے تو شہید نہیں کہلاتے کیونکہ ایک ایسے موقع پر جہاں انسان کو

---

[1] امام حسینؑ نے حجر کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور وہ خاموش ہو گیا۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، گ ۱۶، ص ۱۵)

مصلحت سے کام لینا چاہیے تھا وہاں پر وہ جارحانہ رویہ اپنائے اور مارا جائے تو ایسی موت کو خودکشی کہا جائے گا نہ شہادت۔

صلح امام حسنؑ کے مختلف پہلوؤں پر ہم بات کر چکے ہیں امام حسن مجتبیٰؑ کی صلح کے بعد کے حالات، انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اس طرح سے منظم کئے گئے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات ،خلافت کے نام پر وجود میں آنے والی ملوکیت کے اس کثیف گرداب میں داخل نہ ہو سکے اور یہی امام حسنؑ کا کارنامہ تھا۔ آپؑ نے ایک ایسا کام انجام دیا جس کے ذریعے اسلام کی اصلی تعلیمات کو، جن کا آغاز مکہ سے ہوا اور یہ مدینہ میں اسلامی حکومت کے شکل میں ظاہر ہوئیں اور امیر المومنین علیؑ کے دور حکومت اور خود امام حسنؑ کے دور تک جاری رہیں، ایک نئی جہت دینی تھی۔ یہ اسلام کا تیسرا دور تھا کہ جس میں اسلام نے دوبارہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے نتیجے میں اسلام نابِ محمدی، اسلام کی اصلی تعلیمات ،وہ اسلام جو ظلم کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے،وہ اسلام جو سازشوں کو ناکام بنا دیتا ہے،وہ اسلام جو ہر طرح کی تحریفات سے پاک ہے ،وہ اسلام لوگوں کی ہوا وہوس کے ہاتھ میں کھلونا بننے سے بچ گیا اور اپنی اصلی شکل میں باقی رہ گیا۔، لیکن یہ ایک تحریک کی صورت میں باقی رہا۔یعنی امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں اسلامی طرز فکر جس نے ایک طویل راستے کو طے کرتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی اس نے دوبارہ پلٹ کر ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بلکہ اس دور میں اسلامی تحریک کی ذمہ داریاں خود پیغمبر اسلامؐ کے دور میں ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ مشکل تھیں۔ کیونکہ یہاں دین کا مخالف بھی مذہب اور دین کا نعرہ لگا رہا تھا اور اس نے مذہب کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا جبکہ حقیقت میں دین اور مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور یہی چیز آئمہ معصومینؑ کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ البتہ آئمہ معصومینؑ سے منقول روایات اور ان کے حالات زندگی

کے مطالعے سے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس دن سے صلح امام حسنؑ واقع ہوئی اسی دن سے لیکر آخر تک آئمہ معصومینؑ کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس تحریک کو ایک مرتبہ پھر حکومت میں تبدیل کر سکیں۔ اس حوالے سے بہت ساری روایات پائی جاتی ہیں بلکہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس چیز کا کسی اور انداز سے جائزہ لیں لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ آئمہ اطہارؑ کی پوری کوشش رہی ہے کہ اس تحریک کو حکومت میں بدل سکیں۔ یعنی وہ چاہتے تھے کہ معاشرے کا نظام اس تحریک کے ہاتھ میں ہو جو ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات سے دور اور پاک وصاف ہے لیکن یہ بہت ہی سخت اور مشکل کام تھا۔

اس انقلابی تحریک کے دوسرے دور یعنی سفیانی، اموی اور عباسی خلفاء کے دور میں لوگوں کے لئے سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اسلام اور قرآن کے اصولوں کو سمجھنے اور ان کی پہچان میں غلطی نہ کریں۔ آخر تمام ادیان عالم نیز قرآن کریم میں انسانوں کو اس قدر غور و فکر کی تاکید کیوں کی گئی ہے اور وہ بھی دین کے بنیادی اصولوں یعنی توحید کے بارے میں۔ توحید کا صرف یہ مطلب نہیں کہ ہم کہیں کہ کوئی خدا ہے اور وہ بھی ایک ہے دو نہیں ہیں یہ توحید کی ظاہری صورت ہے جبکہ توحید کا باطن ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں اولیاء الٰہی غوطے لگاتے ہیں۔ توحید ایک بہت ہی باعظمت وادی کا نام ہے لیکن اس باعظمت وادی میں بھی مومنین مسلمین اور موحدین کو غور فکر و تدبر کے ساتھ آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور حقیقت میں بھی غور و فکر ہی انسان کو آگے لے جاسکتا ہے۔ مختلف مراحل میں عقل، وحی کے نور، معرفت کے نور اور اولیاء الٰہی کی تعلیمات سے اپنے لئے غذا حاصل کرتی ہے لیکن پھر بھی جس طاقت کی مدد سے آگے بڑھا جاسکتا ہے وہ عقل کی طاقت ہی ہے، عقل کے بغیر کہیں بھی جایا نہیں جاسکتا۔ ملت اسلامیہ کو ان چند سو سال کے عرصے میں جب خلافت کے نام سے ان پر حکومت

کی گئی (یعنی ساتویں صدی تک جو بنو عباس کی خلافت کا آخری دور تھا (بنو عباس کی خلافت کے بعد بھی بعض مقامات پر خلافت کے نام سے کچھ چیزیں موجود تھیں جیسے ممالک کے دور میں مصر اور اس کے ایک مدت بعد خلافت عثمانیہ کا زمانہ اور دیگر مقامات پر) جس چیز کو سمجھنے کی ضرورت تھی وہ یہ کہ انہیں عقل کو قاضی بنا کر یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ اسلام، قرآن اور معتبر احادیث میں بیان کی گئ صفات حکمرانوں میں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ یہ انتہائِی اہم بات تھی۔ مروانی، سفیانی اور عباسی خلافت، ایسا دور تھا جس میں اسلامی اقدار اپنا وقار کھو چکی تھیں اور ان کے خالی ڈھانچے باقی رہ گئے تھے اور ان اقدار کے بنیادی مضامین جہالت اور شیطانی مضامین میں تبدیل ہو چکے تھے۔

وہ مراکز جو انسانوں کو عاقل، عبادت گزار مومن، آزاد، برائیوں سے دور، اللہ کے حضور میں خاضع اور متکبروں کے مقابلے میں نڈر بنانا چاہتے تھے (اور ان میں سب سے بہترین مرکز خود حضور اکرم ﷺ نے زمانے میں مملکت اسلامی تھی) وہ اب ایسے مراکز میں تبدیل ہو چکے تھے جہاں انسانوں کو مختلف تدابیر کے ذریعے دنیا داری اور ہوس رانی میں مشغول اور انہیں معنویت سے دور کر کے ان کی شخصیت کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے پورے دور خلافت میں یہی سلسلہ جاری رہا۔ تاریخ کی کتابیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں اگر ہم انہیں بیان کرنا چاہیں تو بہت وقت لگے گا۔ یہ سلسہ خود معاویہ ہی کے دور سے شروع ہوا تھا اور وہ اس کام میں مشہور ہو چکا تھا تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک بردبار اور کھلے دل کا آدمی تھا اور وہ اپنے مخالفین کو اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ اس کے سامنے جو چاہیں کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کی زندگی اور شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے وہ کس طرح عام لوگوں، قبائل کے سرداروں اور معاشرے کے

جانے پہچانے لوگوں کو اپنے عقائد اور ایمان سے دستبردار ہونے اور حق کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار کرتا تھا۔ مورخین نے ان چیزوں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے لیکن پھر بھی بعض لوگوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہے۔

خلافت سے وابستہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جاتی تھی کہ انہیں خلیفہ کی رائے اور اس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر لانے کی اجازت نہیں تھی۔ آخر یہ کیسا معاشرہ ہے؟ اور یہ کس قسم کے انسان ہیں؟! لوگوں کے اندر یہ کیسا اسلامی اور الٰہی جذبہ کارفرما ہے کہ جس کی بنا پر وہ معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ کرکے اسے ایک الٰہی معاشرہ بنانا چاہتے ہیں؟ کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟! جاحظ یا شاید ابوالفرج اصفہانی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اپنے دور خلافت میں معاویہ گھوڑے پر سوار ہو کر مکہ جارہا تھا اس کے برابر میں ایک اور شخص بھی اپنے گھوڑے پر سوار چل رہا تھا معاویہ اس شخص کے ساتھ باتوں میں مگن تھا ان کے پیچھے اور لوگ بھی چل رہے تھے۔ معاویہ زمانہ جاہلیت میں بنو امیہ کے کارنامے بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہاں ایسا تھا تو وہاں ویسا تھا میرے باپ ابوسفیان نے اس وقت ایسے کارنامے انجام دیئے۔ راستے میں کچھ بچے کھیل رہے تھے کہ کسی بچے نے ایک پتھر پھینکا اور وہ معاویہ کے ساتھ والے آدمی کی پیشانی پر جا لگا اور اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ اس شخص نے معاویہ کی باتوں میں خلل نہیں ڈالا بلکہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے درد کو برداشت کرتا رہا، معاویہ یوں ہی اپنی باتوں میں مگن تھا کہ اچانک اس کی نظر اس شخص کی پیشانی پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔ ارے، یہ کیا ہوا ہے۔ تمہاری پیشانی سے خون بہہ رہا ہے؟ وہ شخص معاویہ کے جواب میں کہتا ہے، کیا میری پیشانی سے خون بہہ رہا ہے؟ کہاں ہے؟ یعنی وہ شخص یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ، معاویہ کی باتیں سننے میں اس قدر مگن تھا کہ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ

اس کی پیشانی پر پتھر لگا ہے اور خون بہہ رہا ہے! معاویہ نے اس سے پوچھا تعجب ہے! تمہاری پیشانی پر پتھر لگا ہے اور خون بہہ رہا ہے تجھے یہ بھی پتہ نہیں چلا؟ اس نے کہا نہیں! مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: تعجب ہے خون بہہ رہا ہے؟ آپ کی قسم! میں تو آپ کی شیریں کلامی میں اس قدر مگن تھا کہ جب تک آپ نے نہیں بتایا مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میری پیشانی سے خوں نکل رہا ہے! معاویہ نے اس شخص سے پوچھا: بتا بیت المال سے تجھے کتنا مال ملتا ہے؟ اس نے کہا مثلا مجھے اتنا ملتا ہے۔ معاویہ نے کہا: واقعا تیرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے حکم دیا کہ اس کے حصہ کو تین گنا بڑھایا جائے! یہ تھا معاویہ کی حکومت کا مزاج اور اس دور کی ثقافت کا معیار۔

اس زمانے میں جو لوگ سرداروں اور خلفاء کی چاپلوسی کرتے ہوئے ان کے گن گاتے، اختیارات انہی کے ہاتھوں میں ہوتے تھے۔ یہاں پر قابلیت اور معیار کی بنا پر اختیارات دینے کا رواج نہیں تھا۔ بنیادی طور پر عرب معاشرے میں حسب و نسب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے فلاں شخص کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ اور اس کے والدین کون ہیں؟ لیکن یہ لوگ (بنو امیہ) تو حسب و نسب کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔ عبد الملک بن مروان اور ان کے بعض بیٹوں کے دور حکومت میں انہوں نے یوسف بن عمر ثقفی نامی شخص کو ایک طویل عرصے تک عراق پر مسلط کئے رکھا کہ جو انتہائی بد بخت اور کینہ پرور شخص تھا۔ تاریخ میں اس کینہ پروری کے بہت سارے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ شخص چھوٹے قد کا حامل تھا وہ جب درزی کو کپڑے دیتا تو اس سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ کپڑا اس کے سوٹ کے لیے کافی ہے؟ جب درزی کہتا کہ جی ہاں! یہ کپڑا کافی ہے بلکہ تھوڑا کپڑا بچ بھی جائے گا تو وہ اس درزی سے کپڑا واپس لیتے ہوئے اسے گرفتار کرنے اور سزا دینے کا حکم دیتا تھا! جب درزیوں کو اس کی اس عادت کا پتہ چل گیا تو جب

بھی وہ کسی درزی کو کپڑا سینے دیتا اور پوچھتا کیا یہ کپڑا میرے لیے کافی ہے؟ تو درزی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا، نہیں جناب شاید یہ کپڑا آپ کی قدو قامت کے لیے کم پڑ جائے لیکن ہمیں کافی محنت کرنی ہو گی تا کہ اسے آپ کی قد و قامت سے مطابق بنا سکیں! یہ ایسا احمق اور بے وقوف شخص تھا کہ یہ جاننے کے باوجود کہ درزی جھوٹ بول رہا ہے اس کی بات پر خوش ہوتا تھا ۔ یہ وہی تھا جس نے کوفہ میں زید بن علیہ السلام کو شہید کیا۔ ایک ایسا شخص کئی سالوں تک لوگوں کی جان ومال اور عزت و آبرو پر مسلط تھا۔ یہ نہ تو کوئی صحیح حسب ونسب رکھتا تھا اور نہ ہی عقل و شعور کا مالک تھا لیکن صاحبان اقتدار سے وابستہ تھا اس لیے اس کو اس منصب پر بٹھایا گیا تھا ۔ یہ چیزیں کسی بھی نظام کے لیے بہت بڑی آفت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ اسلام مخالف تحریک اسی طرح جاری و ساری تھی جبکہ اس کے مقابلے میں حقیقی اسلامی اور قرآنی اقدار پر مبنی تحریک (جو کسی بھی صورت میں اس غیر اسلامی تحریک کے مقابلے میں گھٹنے ٹیکنے والی نہیں تھی) بھی جاری و ساری تھی جس کی سب سے واضح مثال آئمہ معصومینؑ اور ان کے باوفا اصحاب ہیں۔ امام حسن مجتبیٰؑ کی برکت سے اسلامی اقدار پر مبنی تحریک نے اسلام کو بچا لیا۔ اگر امام حسنؑ صلح نہ کرتے تو دین اسلام کی حقیقی اقدار میں سے کچھ بھی باقی نہ بچتا بلکہ سب کچھ ختم ہو جاتا کیونکہ اس صورت میں بظاہر غلبہ تو معاویہ ہی کو حاصل ہونا تھا کیونکہ حالات یہ بتاتے ہیں امام حسنؑ کو کامیابی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بلکہ کامیابی معاویہ ہی کو ملنے والی تھی کیونکہ تمام تبلیغاتی ذرائع پر اس کا قبضہ تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان اس کی شخصیت بھی جانی پہچانی تھی وہ کوئی غیر معروف آدمی نہیں تھا۔

امام حسن مجتبیٰؑ اگر صلح نہ کرتے تو خاندان رسالت کے تمام افراد مارے جاتے اور معاویہ ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا اور اسلام کی اصلی اقدار کی حفاظت کا کام انجام نہ پاتا ،

سب کچھ ختم ہو جاتا اور اسلام کا کوئی نام لیوا باقی نہیں بچتا اور واقعہ عاشورا کی نوبت ہی نہ آتی۔ یعنی اگر امام حسنؑ معاویہ کے ساتھ اس جنگ کو جاری رکھتے تو اس کے نتیجے میں خاندان رسالت ﷺ کے تمام افراد ختم ہو جاتے۔ امام حسنؑ کے علاوہ حجر بن عدی اور ان جیسے نامور اصحاب قتل کر دیئے جاتے۔ کوئی ایسا شخص باقی نہیں بچتا جو اسلام کی حقیقی اقدار کی حفاظت کر سکے۔ اس لیے امامؑ نے صلح کی اور یہ امام حسن مجتبیٰؑ کا اسلام پر بہت بڑا احسان ہے۔

البتہ صلح امام حسنؑ ایک زبردستی کی صلح تھی لیکن پھر بھی ایک صلح واقع تو ہوئی تھی لیکن امام حسنؑ دل سے اس کے لیے راضی نہ تھے۔ اس لیے امام حسنؑ نے جن شرائط پر معاویہ کے ساتھ صلح کی ان شرائط نے معاویہ کی سیاست کو متزلزل کر دیا تھا۔ صلح امام حسنؑ اور اس کی شرائط بھی ایک الٰہی تدبیر تھی "وَمَکَرُوا وَمَکَرَ اللہ [1]" یعنی اگر امام حسنؑ اس وقت معاویہ کے ساتھ جنگ کرتے تو یقیناً مارے جاتے اور وہ بھی اپنے ہی اصحاب کے ہاتھوں جنہیں معاویہ کے جاسوسوں نے بھاری رقوم دے کر خریدا تھا اور معاویہ کہتا کہ حسن ابن علیؑ کو میں نے تو نہیں مارا بلکہ خود انکے اصحاب ہی نے مارا ہے عین ممکن ہے کہ وہ اس صورت میں امام حسنؑ کے لیے مجلس ترحیم کا بھی اہتمام کرتا[2]، لیکن بعد میں امیر المومنینؑ کے اصحاب کو ایک ایک کر کے تہہ تیغ کر دیتا اور

---

[1] آل عمران / ۵۴ (انہوں (دشمنوں) نے مکاری کی تو اللہ نے بھی جوابی تدبیر کی اور خدا بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔)

[2] بالکل حضرت عثمان کے قصہ کی طرح ہوتا اور اس بار وہ امام حسن کے خون کا انتقام لینے کے لئے میدان میں کود پڑتا اور جن لوگوں کا بھاری رقوم کے عوض خریدا تھا ان کو بھی اور امام نکے سچے وفاداروں کو بھی خون خواہی امام حسن علیہ السلام کے بہانے تہہ تیغ کر دیتا اور یوں دنیا پر یہ ثابت کرتا کہ امام حسن کے قاتل خود ان کے شیعوں میں تھے اور نے ان کو سب کو قتل کر کے خونِ امام حسن علیہ السلام کا بدلا لے لیا ہے یوں وہ ایک طرف اپنے تمام دشمنوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا اور دوسری طرف اہل بیت کے خون کا انتقام لینے والے کی حیثیت سے اپنی اور اپنے بعد یزید اور باقی آلِ امیہ کی حکومت اور ظلم کو ایسا لبادہ اوڑھا دیتا جو لباس شریعت کہلاتا اور اس کو روکنے ٹوکنے ولال بھی کوئی نہ ہوتا۔

شیعہ نام کا کوئی ایک شخص بھی باقی نہیں بچتا جو بیس سال بعد کوفہ میں امام حسینؑ کو دعوت دے سکے۔ لہٰذا امام حسنؑ نے تشیع کی بنیادوں کو بچایا تاکہ بیس سال بعد حکومت کی باگ ڈور اہل بیت رسول ﷺ کے ہاتھ آجائے۔

جب امام حسن مجتبیٰؑ نے معاویہ سے صلح کر لی تو بہت سے جاہل اور کم فہم لوگوں نے آپؑ کو مختلف طریقوں سے تنقید کا نشانہ بنایا۔ کبھی وہ آپؑ کو مومنین کی ذلت اور رسوائی کا باعث گردانتے ہوئے کہتے تھے [1] "آپؑ نے معاویہ کے ساتھ صلح کر کے مومنین کی اس پر جوش جماعت کو ذلیل و رسوا کر دیا ہے اور انہیں معاویہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا ہے۔" کبھی احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذرا دھیمے لہجے میں یہی باتیں دہرائی جاتی تھیں۔ لیکن امامؑ ان تمام اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں ان سے صرف ایک جملہ ارشاد فرماتے تھے جو شاید آپؑ کے تمام فرمودات میں سب سے زیادہ واضح اور بہتر ہے اور وہ جملہ ہے: ماتدری لعلۃ فتنۃ لکم ومتاع الی حین [2] تمہیں کیا معلوم شاید یہ تمہارے لیے ایک آزمائش ہو اور معاویہ کے لیے ایک عارضی سرمایہ ہو۔ آپؑ کا یہ جملہ در حقیقت قرآن کریم کا ایک اقتباس ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آپؑ کو مستقبل کا انتظار تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ آپؑ کی نظر میں حق سے منحرف اور نا قابل قبول حکومت برطرف ہو جائے اور اس کی جگہ آپؑ کی پسند کی ایک حکومت قائم ہو جائے۔ لہٰذا آپؑ ان لوگوں سے مخاطب ہو کر

---

[1] یامذل المومنین (تحف العقول، ص۳۰۸)

[2] ماخوذ از سورہ انبیاء آیت ۱۱۱، مجھے نہیں معلوم شاید یہ تمہارے لیے آزمائش ہو (بحارالانور، ج۴۴، ص۵۶)

فرماتے ہیں تم صلح کے فلسفہ کو نہیں جانتے ہو تمہیں کیا معلوم شاید اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہو؟

صلح کے آغاز ہی میں (جب) شیعہ عمائدین میں سے دو مشہور شخصیات، مسیب بن نجبتہ اور سلیمان بن صرد خزاعی چند مسلمانوں کے ہمراہ امام حسن مجتبیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہمارے پاس خراسان اور عراق وغیرہ میں خاصی افرادی قوت موجود ہیں اور ہم اسے آپ کے اختیار میں دینے کے لیے تیار ہیں اور معاویہ کا شام تک تعاقب کرنے لے لیے حاضر ہیں تو آپؑ نے انہیں تنہائی میں گفتگو کے لیے طلب کیا اور کچھ بات چیت کی اور جب وہ آپؑ کے ہاں سے باہر نکلے تو ان کے چہرے پر اطمینان کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے فوجی دستوں کو رخصت کر دیا حتیٰ کہ ساتھ آنے والوں کو بھی کوئی واضح جواب نہ دیا۔

طحہ حسین[1] کا یہ دعوی ہے کہ دراصل اسی ملاقات میں شیعوں کی تحریک کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا تھا یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰؑ نے ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر اور آپس میں بات چیت کر کے ایک عظیم شیعہ تنظیم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ چناچہ خود امام حسنؑ کے حالات زندگی اور مقدس ارشادات سے بھی واضح طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے اگرچہ وہ زمانہ اس قسم کی تحریک اور سیاسی جدوجہد کے لیے سازگار نہ تھا (کیونکہ) لوگوں میں سیاسی شعور بے حد کم اور دشمن کے پروپیگنڈوں نیز مالی وسائل کے بے دریغ استعمال کا بازار گرم تھا۔ دشمن جن طریقوں سے فائدہ اٹھا رہا تھا، آپ ان طریقوں کو اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً بے حساب پیسہ خرچ کرنا اور

---

[1] مشہور معاصر مصری مورخ۔

معاشرہ کے چھٹے ہوئے بد قماش افراد کو اپنے گرد اکٹھا کر لینا آپ کے لئے ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے دشمن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا اور اس حوالے سے امام عالی مقامؑ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

حضرات امام جعفر صہ علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں آپ فرماتے ہیں: "وقت ھذا الامر فی اسبعین"[1] یعنی تقدیر الٰہی میں یہ تھا امیر المو ٔ علیہ السلام کے شہادت کے تیس سال اور امام حسینؑ کی شہادت کے دس سال بعد حکومت اسلامی کی باگ ڈور اہل بیت رسولؐ کو واپس کی جائے لیکن اتنا بڑا نتیجہ کب سامنے آنا تھا؟ جب لوگ اپنے قصد اور ارادے کے ساتھ اس کے لئے اقدامات کریں۔ کیونکہ اللہ تعالی کی کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے ! لوگوں نے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ادا نہیں کیں ۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے اپنے ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیا لیکن خواص جیسے عبد اللہ ابن جعفر اور عبد اللہ ابن عباس اور ان جیسے دوسرے لوگوں نے اپنی ذمہ داریوں کو نہیں نبھایا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے بھی جنھوں نے بعد میں واقعہ کربلا میں امام حسینؑ کے ہم رکاب ہو کر جنگ کی انہوں نے بھی جناب مسلم ابن عقیل (سفیر امام حسینؑ) کے ساتھ وہ تعاون نہیں کیا جس طرح کرنا چاہیے تھا، بلکہ انہوں نے کوتاہی کی ورنہ جناب مسلم کے ساتھ وہ نہ ہوا ہوتا جو تاریخ نے ثبت کیا۔ انہیں جناب مسلم کے ساتھ مل کر حکومت کوفہ کا قصہ تمام کر دینا چاہیے تھا جو نہیں کیا اور ان لوگوں کی یہی کوتاہی کربلا کے دلخراش واقعہ کا سبب بنی۔

---

[1] اللہ تعالیٰ نے اس امر کے لئے ستر ہجری کو معین فرمایا تھا-(الکافی، ج ا ص ۳۶۸)

اس کے بعد امام جعفر صادقؑ مزید فرماتے ہیں: فلما ان قتل الحسین صلوات اللہ علیہ اشتد غضب اللہ تعالی علی اہل الارض فاخرہ الی اربعین ومائۃ[1] یعنی یہ کام تاخیر کا شکار ہو گیا اور (میرے خیال میں) ایک سو چالیس ہجری تک پہنچ گیا یعنی ستر سال مزید تاخیر ہو گئی اور بنو عباس کے دور خلافت تک پہنچ گیا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ امام حسنؑ کی صلح ایک عظیم کام کا مقدمہ قرار پائی ورنہ آئمہ معصومینؑ اتنی آسانی کے ساتھ کب اپنے موقف سے دست بردار ہونے والے تھے اور کیا ولایت اور حکومت کا مسئلہ کوئی چھوٹی بات تھی؟ نہیں! بلکہ یہ دین کی بنیاد تھی لیکن اس قسم کے حالات درپیش تھے کہ امام کو صلح کرنا پڑی۔

صلح امام حسنؑ کے بارے میں (اب تک) بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے لیکن میں یہاں پر اس عظیم واقعہ کا ایک دوسرے زاویہ سے جائزہ لینا چاہتا ہوں کیونکہ اس واقعہ کا تعلق تاریخ کے ایک انتہائی حساس موڑ سے ہے جو اسکی اہمیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ چونکہ تاریخ اسلام ایسے سیاسی واقعات سے بھری پڑی ہے جیسے پیغمبر اسلام ﷺ، امیر المومنینؑ اور دوسرے آئمہ معصومینؑ کے دور کے واقعات یا بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفاء کے دور کے واقعات وغیرہ لیکن صلح امام حسنؑ جیسے واقعات جو پوری تاریخ اسلام پر اثر انداز ہوئے ہوں بہت کم ہیں۔ میری نظر میں تاریخ اسلام میں اس قسم کے چند ایک ہی واقعات پائے جاتے ہے جو اس طرح پوری تاریخ پر اثر انداز ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو صدیوں پر مشتمل تاریخ اسلام میں صلح امام حسنؑ کا واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

---

[1]۔ جب امام حسینؑ کو شہید کر دیا گیا تو اہل زمین پر اللہ تعالی کے غضب میں شدت پیدا ہو گئی اور (تاسیس حکومت کا) وقت ۱۴۰ھ تک کے لئے آگے گیا۔ (الکافی، ج۱، ص۳۶۸)

اس واقعہ کا ایک اہم رکن اسلامی خلافت کا ملوکیت میں تبدیل ہونا ہے۔ اگر ہم اس نکتہ پر غور و فکر کریں تو یہ جملہ بہت ہی پر مغز اور انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ خلافت اور ملوکیت دو الگ قسم کے طرز حکومت ہیں۔ ان دونوں قسم کے طرز حکومت میں صرف دو چار چیزوں میں اختلاف موجود نہیں بلکہ یہ سرے سے ایک دوسرے سے جدا ہیں یعنی خلافت کوئی اور چیز ہے جبکہ ملوکیت (بادشاہت) دوسری چیز ہے۔ جن کا مسلمانوں اور اسلامی معاشرے پر حکمرانی کا انداز مختلف ہے۔ اس واقعے نے تاریخ اسلام کا رخ موڑ دیا اور رخ موڑنے کا مطلب تو آپ جانتے ہی ہیں جیسا کہ ایک ریل گاڑی کہ جو شمال کی طرف رواں دواں ہے کسی ایک مقام پر ڈرائیور اس کے ٹریک کو تبدیل کرتے ہوئے اس کا رخ دوبارہ جنوب کے طرف موڑ دیتا ہے البتہ یہ ایک دم محسوس نہیں ہوتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد جب انسان پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تب اسے احساس ہونے لگتا ہے۔ میں اس واقعے کو اس نظر سے دیکھتا ہوں۔

حضرت امام حسن مجتبیٰؑ کی امیر شام سے صلح کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا آج کی اصطلاح میں گویا طاقت ایک گروہ سے دوسری گروہ کو منتقل ہوئی۔ (اب دیکھنا یہ ہے کہ) ان دونوں گروہوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ جو دو پارٹیوں نے ایک دوسرے کی جگہ لے لی ہے ان کے درمیان کیا فرق ہے؟ یہ ایک بات ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب باطل تحریک نے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیا تو اس نے اسلامی معاشرے پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے کون سے حربے استعمال کیے؟ تیسری بات یہ کہ جب حقیقی جماعت (امام حسنؑ اور ان کے ساتھی) کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا تو اس نے باطل تحریک کے مقابلے میں صبر و استقامت کے کون سے طریقوں کو اپنایا؟ یعنی اس نے کون کون سے طریقے اختیار کیے؟ چوتھی بات یہ کہ شکست کی وجوہات کیا تھیں یعنی وہ کون سے عوامل تھے کہ جن کی بنا پر حق کو شکست کا سامنا کرنا پڑا؟ اس کی کیا وجوہات

تھیں؟ پانچویں بات یہ کہ فاتح گروہ، مغلوب گروہ کے ساتھ کس طرح پیش آیا؟ یہ اس واقعہ کا انتہائی اہم اور عبرت ناک باب ہے۔ چھٹی چیز مغلوب گروہ کا فاتح کے ساتھ کیسا رویہ رہا؟ اس گروہ نے کون سی پالیسی اختیار کی؟ ساتویں بات یہ کہ اس واقعہ کا نتیجہ کیا نکلا؟

ان دونوں تحریکوں کی بہت سی خصوصیات ہیں ان میں سے بعض کا تعلق حق سے ہے جب کہ بعض کا تعلق باطل سے ہے۔ اگر میں یہاں ان خصوصیات کو ایک ایک کر کے گننا چاہوں تو ایک طویل فہرست بن جائے گی (لہٰذا) میں نے ان کا خلاصہ کیا ہے۔ حق کی تحریک یعنی امام حسنؑ کے گروہ کی نظر میں سب سے اہم چیز دین تھا، دین سے مراد کیا ہے؟ یعنی لوگوں کے ایمان اور عقیدے میں دین باقی رہے۔ لوگ ایمان اور عمل میں دین کی پابندی کریں اور معاشرے پر بھی دین حاکم ہو۔ یعنی ان کی نظر میں اصل بات یہ تھی کہ معاشرہ دین کی قوت، دین کی حاکمیت اور دین کے دائرے میں رہتے ہوئے آگے بڑھے۔ دوسرے الفاظ میں معاشرے میں اسلامی نظام نافذ ہو۔

جبکہ اقتدار ہاتھ میں لینا حکومت قائم کرنا اور امور کو اپنے ہاتھوں میں لینا اور اس قسم کے دیگر فردی مسائل ان کی نظر میں، دوسرے تیسرے اور چوتھے درجے کے کام تھے۔ ان کی نظر میں بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ اس نظام اور معاشرے پر دین کی حاکمیت کار فرما ہو اور جو لوگ اس معاشرے میں رہ رہے ہے ان کا ایمان نہ صرف باقی رہے بلکہ ان کے دلوں کی گہرایوں میں بھی راسخ ہو۔ یہ تھی گروہِ حق کی پہلی خصوصیت۔

دوسرا گروہ یعنی باطل جماعت جس کا اصل مقصد کسی بھی طریقہ سے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا تھا۔ یعنی ہر قیمت پر اقتدار کا حصول یہ تھی باطل گروہ کی اصل سیاست ۔ اس کی نظر میں اصل چیز اقتدار کا حصول تھا چاہے کسی بھی قیمت اور کسی بھی طریقہ سے ہو۔

جیسا کہ دنیا کے اکثر سیاست دانوں کا یہی طریقہ ہے ان کی نظر میں اقدار اور اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی اصول کو اپنا سکیں تو ٹھیک ہے اور اگر نہ اپنا سکیں تو بھی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ ان کے لیے سب سے اہم چیز اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے اور یہی ان کے لیے اہمیت کا حامل ہے اور یہ ایک انتہائی اہم اور حساس سرحد ہے۔

ممکن ہے کہ کبھی دونوں گروہ بظاہر مذہب پر عمل پیرا ہوں جیسا کہ امیر المومنینؑ اور امیر شام کے درمیان ہونے والی جنگ میں ایسا تھا۔ ایک دن (جنگ صفین کے موقع پر کہ جو حضرت علیؑ اور امیر شام کے درمیان لڑی گئی تھی) امیر المومنینؑ کے کچھ سپاہی شک اور تردید کا شکار ہوئے۔ بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جب وہ شک میں پڑ جاتے اور ان کے ذہنوں میں مشکوک افکار جنم لیتے ہیں تو نہ خود ان مشکوک مسئلوں کو حل کرتے ہیں اور نہ ہی قابل اطمینان لوگوں سے رجوع کرتے ہیں بلکہ وہ انہی شکوک شبہات کو موضوع بنا کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور دوسروں کے ذہنوں میں شک ڈالتے ہیں اور غلط افکار پر مبنی ایک گروہ پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ اس قسم کے افراد (جنگ صفین کے موقع پر) شک و تردید کا شکار ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپس میں کیوں لڑیں؟ وہ نماز پڑھتے ہیں اور ہم بھی نماز پڑھتے ہیں وہ بھی قرآن پڑھتے ہیں اور ہم بھی قرآن پڑھتے ہیں وہ بھی پیغمبر اسلام ﷺ کو مانتے ہیں اور ہم بھی مانتے ہیں۔ پس وہ لوگ شک و تردید کا شکار ہو گئے۔

عمار یاسر جن کے بارے میں، میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ صدر اسلام میں وہ ایسے حساس، مشکل اور پیچیدہ مسائل کہ جن کے بارے میں لوگ غفلت اور جہالت کا شکار تھے، کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے ماہر تھے۔ تاریخ اسلام میں عمار یاسر کا یہ مقام ہے کہ وہ گہرے اور دقیق مسائل کو سمجھتے تھے۔ اگر ہم مالک اشتر کو ان کی تلوار اور بہادری سے پہچانتے ہیں تو ہمیں عمار

یاسر کو انکی فصاحت زبان، روشن فکری، درست فہم وادراک اور صدر اسلام کے ایک عظیم تجزیہ نگار کے طور پر جاننا چاہیے۔ امیر المومنینؑ کے دور میں مجھے ایسے بہت کم مواقع ملے جہاں شکوک و شبہات نے جنم لیا ہو اور وہاں عمار یاسر موجود نہ ہوں۔ وہ ایک مافوق الفطرت شخص تھے۔ (جنگ صفین کے موقع پر بھی جب) عمار یاسر کو یہ اطلاع ملی کہ لشکر کے کچھ سپاہی شک وتردید کا شکار ہو چکے ہیں تو وہ ان تک پہنچ گئے اور ان کے سامنے کچھ حقائق بیان کیے۔ آپ نے واضح کیا کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ بھی نماز پڑھتے ہیں اور ہم بھی نماز پڑھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! میں نے ایک اور جنگ میں دیکھا ہے کہ یہی دونوں پرچم جو آج ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہیں، یہ پرچم جس کے نیچے امیر المومنینؑ موجود ہیں اسی طرح اس پرچم کے مقابلے میں تھا جس کے نیچے معاویہ کھڑا ہے اور وہ جنگ بدر کا موقع تھا۔ یہ دونوں پرچم، یعنی بنو ہاشم اور بنو امیہ کا پرچم ایک دوسرے کے مد مقابل تھے اور اس پرچم کے سایہ تلے حضرت رسول اکرم ﷺ اور امیر المومنینؑ تھے اور اس پرچم کے نیچے یہی معاویہ اور اسکا باپ (ابو سفیان) تھے۔ ان دونوں کے درمیان اصولی اختلاف پایا جاتا ہے لہٰذا آپ ظاہر کو مت دیکھیں (اسی طرح عمار یاسر نے) ان کے ذہنوں سے شکوک و شبہات کو دور کر دیا۔

پس معلوم ہوا کہ باطل تحریکیں جن کا اصل مقصد حصول اقتدار ہوتا ہے وہ بھی کبھی کبھار (مصلحتاً) اسلام کے ظواہر پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ اور یہ (انکے حق پر ہونے کی) کوئی دلیل نہیں ہے لہٰذا ضروری ہے کہ (انکے) باطن کو دیکھا جائے اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ یہ تشخیص دی جائے کہ کونسی تحریک کس سے وابستہ ہے۔ یہ پہلی بات ہے۔

ان دونوں تحریکوں کی پہچان اور علامت یہ ہے کہ ایک طرف اقتدار پرستی اور اقتدار کو تحفظ دینا ہے تو دوسری طرف اصول پرستی اور اقدار کا تحفظ اور پاسداری ہے۔ اسلام اور اس کے

بنیادی افکار یعنی اسلامی اقدار کو قبول کرنا، اور ان کے تحفظ کے لئے جدوجہد اور جہاد کرنا۔ اس ایک طرف اقدار، اصول پرستی اور انکا تحفظ ہے اور دوسری طرف اقتدار پرستی ہے یعنی ہر قیمت پر اقتدار کو اختیار میں لینا، یعنی کچھ بھی ہو جائے وہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے۔ لیکن یہ باطل تحریکیں کون سے طریقے اور ذرائع سے استفادہ کرتی ہے؟ یہ بھی ایک اہم اور توجہ طلب نکتہ ہے۔ ہمیشہ باطل تحریکیں مختلف طریقہ کار اپناتی ہیں۔ معاویہ کا منصوبہ ایسے طریقوں پر مشتمل تھا جو اس کے اقتدار، طاقت اور تحفظ سے عبارت ہے۔ اس کے ہر عمل سے کسی نہ کسی حوالے سے اپنے اقتدار کے استحکام کا مقصد نکلتا ہے۔ اس کے اقدامات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

- طاقت کا اظہار، بعض جگہوں پر وہ اپنی طاقت کا بھرپور اظہار کرتا ہے اور (اپنے مخالفین کی) بی رحمی سے سرکوبی کرتا ہے۔
- دولت اور پیسہ کا استعمال، جو سازشی عناصر کے لئے ایک بہترین ذریعہ آمدنی ہے۔
- تبلیغ اور جھوٹا پروپیگنڈا۔
- سیاست بازی یعنی سیاسی طریقوں سے اپنے مخالفین کو شکست دینا۔ یہ وہ حربے تھے جس سے معاویہ خوب استفادہ کرتا تھا۔

ملاحظہ کیجئے کہ معاویہ ایک جگہ اس قدر سختی سے پیش آتا ہے کہ حجر بن عدی جن کا شمار پیغمبر اسلام صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّم کے نامور اصحاب میں ہوتا ہے کہ جنہیں قتل کر دینا اس کے لئے انتہائی مہنگا بھی پڑ سکتا ہے لیکن وہ انہیں قتل کرا دیتا ہے۔ رشید ہجری کا تعاقب کرتا ہے یہاں تک کہ انہیں بھی شہید کر دیتا ہے۔ زیاد بن ابیہ (جو ایک انتہائی ظالم، بداخلاق، بے حسب و نسب اور طاقت کا دلدادہ شخص تھا)، کو کوفہ کا (کہ جو تشیع اور پیروان ولایت کا گڑھ تھا)، گورنر مقرر کرتا ہے

اور اسے پورے اختیار دے دیتا ہے کہ جو تم چاہو کر سکتے ہو۔ اسی زیاد بن ابیہ کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ اخذک بالظنۃ و قتلک اولیائہ بالتھمۃ[1] جس شخص کے بارے میں معمولی بھی شک ہوتا کہ اس کا جھکاؤ اہل بیت اطہارؑ کی طرف ہے، اسے گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیتا تھا اور اسے سخت اذیتیں دیتا تھا اور جس شخص پر اہل بیتؑ سے تعاون کا الزام لگتا اسے قتل کر کے اس کا نام و نشان مٹا دیتا تھا یعنی عراق اور کوفہ میں جو شیعیان اہل بیت کا مرکز تھا ایک عجیب افرا تفری اور دگرگونی کی صورت حال تھی۔(معاویہ) کہیں اس طرح اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا تھا اور دوسری جگہ یہی معاویہ ہے مگر اس کا کردار آپ دیکھ لیں کہ جب کسی قبیلہ کی ایک ضعیف خاتون آ کر اسے گالیاں دیتی ہے اور خوب برا بھلا کہتی ہے کہ تم نے یہ کیا وہ کیا تو معاویہ اسے کچھ بھی نہیں کہتا بلکہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔

عدی بن حاتم اس حالت میں امیر شام کے پاس آتے ہیں کہ جب وہ دونوں آنکھوں سے نابینا ہو چکے ہیں۔ معاویہ کہتا ہے کہ اے عدی! علیؑ نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا تم نے میرے ساتھ علیؑ کی جنگ میں اپنے دونوں بیٹوں کو کھو دیا لیکن علیؑ نے اپنے دونوں بیٹوں یعنی حسنؑ اور حسینؑ کو بچا کر رکھا۔ عدی بن حاتم نے روتے ہوئے کہا: معاویہ! حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے علیؑ کے ساتھ انصاف نہیں کیا کیونکہ وہ تو شہید ہو کر اپنے رب سے ملاقات کر چکے جب کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔

---

[1] تم لوگوں کو شک کی بنا پر گرفتار کرتے ہو اور اولیاء الٰہی پر جھوٹے الزامات لگا کر قتل کر دیتے ہو۔(الدرجات الرفیعہ، ص ۳٦۰)

امیر شام کے دربار میں جب کبھی کسی اہل بیتؑ کے چاہنے والے کی موجودگی میں امیر المومنینؑ کی شان میں معمولی سی گستاخی بھی کی جاتی ہے تو وہ اپنی پوری طاقت اور شجاعت کے ساتھ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف احتجاج کرتا اور معاویہ ہنستے ہوئے نظر انداز کر دیتا یہاں تک کہ وہ کبھی کبھار روتے ہوئے کہتا: جی ہاں آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ شاید ان باتوں کا قارئین کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے۔ یہ پروپیگنڈہ ہی ہے کہ پوری تاریخ میں باطل قوتوں نے ا سے خطرناک اور مسموم ترین وسیلہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حق کی تحریکیں باطل تحریکوں کی طرح پروپیگنڈوں سے کام نہیں لے سکتیں۔ کیونکہ جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعہ کسی کے ذہن کو مکمل طور پر متاثر کرنا چاہیں تو اس کے لئے بہت زیادہ ڈھکوسلہ، جھوٹ اور فریب سے کام لینا پڑتا ہے جو حق کی تحریکوں کے لئے ناممکن ہے۔ یہ باطل تحریکیں ہی ہیں کہ جن کے نزدیک ان کاموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اہمیت اس بات کی ہے کہ ایک حقیقت کو کسی دوسری شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ اس کام کے لئے تمام وسائل سے استفادہ کرتی ہیں۔

آپ یہ سنتے رہتے ہیں کہ جب امیر المؤمنین امام عَلَيْهِ السَّلَامُ محراب عبادت میں شہید کر دیئے گئے تو اہل شام کو تعجب ہوا کہ علیؑ، محراب عبادت میں کیا کر رہے تھے؟ محراب تو نمازیوں کی جگہ ہے! بعض لوگوں کو ان باتوں پر یقین نہیں آتا لیکن یہ حقیقت ہے۔ معاویہ نے کئی سالوں پر مشتمل حکومت کے دوران اور اس سے قبل اسکے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان کے دور حکومت میں مختلف پروپیگنڈوں کے ذریعے شام کے ماحول کو اس قدر دھندلا یا گیا اور لوگوں کے ذہنوں کو خراب کیا گیا تھا کہ وہ اس کی جھوٹی باتوں کے علاوہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ معاویہ اور بنو امیہ کی حمایت اور اہل بیت اطہارؑ کے خلاف جھوٹے پڑوپیگنڈے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیائے اسلام میں ہجرت کے سو سال بعد یعنی شاید امیر المؤمنینؑ کی شہادت کے چالیس پچاس سال بعد تک منبروں سے آپؑ پر لعن وطعن ہوتا رہا۔ اسلامی دنیا میں لعن طعن کا بانی خود معاویہ ہے اور یہ اس کے اخلاق کا معیار تھا۔ بعض لوگ اہل تشیع کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے برا بھلا کہتے ہیں کہ وہ کیوں بعض صحابہ پر لعن طعن کرتے ہے جب کہ یہ وہ کام ہے کہ جس کی بنیاد خود معاویہ نے رکھی تھی۔ جس نے امیر المومنین امام علیؑ کہ جن کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا تھا: افضل القوم واقدمهم اسلاما[1] وہ علیؑ جو اصحاب میں سب سے زیادہ آپ ﷺ کے سب سے قریب اور اسلام لانے میں پہل کرنے والے تھے۔ ان پر سالوں تک منبروں سے سب وشتم ہوتا رہا، آپؑ کی برائیاں کی گئیں یہاں تک کہ عمر بن عبد العزیز جب خلیفہ بن گیا تو اس نے اس سلسلے کو ممنوع قرار دیتے ہوئے کہا کہ آج کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔

عبد الملک بن مروان کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے دو بیٹے ولید اور سلیمان خلیفہ بنے اس کے بعد دو سال کے لیے خلافت عمر بن عبد العزیز کو ملی دو سال کے بعد دوبارہ خلافت عبد الملک کے دوسرے دو بیٹوں یعنی یزید اور ہشام کے حصہ میں آئی۔ جب خلافت عمر بن عبد العزیز کو ملی تو اس نے ان لوگوں کو امیر المومنین امام علیؑ پر سب وشتم سے روکا۔ شروع شروع میں تو لوگوں کو اس کام پر تعجب ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس بات کے عادی ہوتے گئے۔

---

[1] قدزوجتک اقدمهم اسلاما واعظم حلماً واحسنهم خلقاً واعلم بالله علماً: حضرت رسول اکرم ﷺ اپنی بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں، میں نے تمہاری شادی ایک ایسے شخص سے کی ہے کہ جو سب سے پہلے اسلام لایا، جو حلم میں سب سے بڑا ہے، جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے، جو سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہے۔ (عوالم العلوم والمعارف، ج۱۱، ص۳۸۳)

میں نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ دنیائے اسلام میں کوئی قاری، محدث اور راوی ایسا باقی نہیں، جسے معاویہ اور بنو امیہ کے حکومتی کارندوں نے اہل بیت اطہارؑ کے خلاف اور بنو امیہ کے حق میں احادیث گڑھنے اور ان کے حق میں آیات الٰہی کی تفسیر بیان کرنے اور اس قسم کے دوسرے کاموں کے لیے تیار نہ کیا ہو۔

سمرۃ بن جندب کی مشہور حدیث "لاضرر ولاضرار"[1] بھی اسی سے مربوط ہے۔ اس کا تعلق اصحاب پیغمبر اسلام ﷺ سے ہے البتہ یہ ایک ایسا صحابی ہے کہ آپؐ اس سے نفرت کرتے تھے ۔ اس کی وجہ وہی مشہور داستان ہے کہ کسی انصاری کے گھر کے صحن میں سمرہ کا ایک درخت تھا اور وہ اپنے درخت کو دیکھنے کے بہانے بغیر اطلاع کے اچانک اس انصاری کے صحن میں داخل ہو جایا کرتا تھادر حالیکہ گھر میں انصاری کے بیوی بچے سب موجود ہوتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اچانک ایک شخص بغیر اطلاع کے ان کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے سمرہ کی اس حرکت سے ان کو بہت تکلیف پہنچتی تھی لہٰذا وہ انصاری اس شخص کی شکایت لے کر پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے سمرہ بن جندب سے کہا کہ وہ اس درخت کو انصاری کے ہاتھوں فروخت کر دے لیکن اس نے اس نے ایسا کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ درخت میری ملکیت ہے میں اسکی دیکھ بھال کے لیے جاتا رہوں گا۔ یہ سن کر پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا چلو اس درخت کو میرے ہاتھ فروخت کر دو، اس نے قبول نہیں کیا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: میں تجھ اس

---

[1] لاضرر و لاضرار فی الاسلام: یعنی اسلام میں نہ تو خود نقصان اٹھانے کی اجازت ہے اور نہ ہی دوسروں کو پہنچانے کی۔ (من لایحضرہ الفقیہ ۳۳۴)

درخت کے بدلے جنت میں ایک درخت کی ضمانت دیتا ہو"۔ گویا آپؐ نے اسے جنت کا وعدہ بھی کیا لیکن اس نے قبول نہیں کیا اور کہا مجھے ہر صورت میں یہی درخت چاہیے۔ اس کی یہ بات سن کر آپؐ نے مالک مکان کو حکم دیا کہ گھر جا کر اس کا درخت جڑ سے اکھاڑ کر باہر پھینک دو تاکہ یہ اسے لے جائے آپؐ نے فرمایا: لاضرر ولاضرار فی الاسلام: یعنی دین اسلام میں ضرر اور ضرار کے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس بہانے سے کہ یہاں آپ کی چیز ہے آپ کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے کیونکہ اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ "لا ضرر" کی یہ مشہور حدیث جسے ہمارے ہاں ایک فقہی اصول کی حیثیت حاصل ہے، کا تعلق اسی سمرہ بن جندب سے ہے۔

یہ شخص امیر شام کے دور حکومت تک زندہ رہا۔ اس کی عاقبت کو دیکھ لیجئے معاویہ اصحاب پیغمبر اکرم ﷺ کی تلاش میں رہتا تھا کیونکہ معاشرے میں ان کا ایک نام اور مقام تھا لہٰذا وہ انہیں اپنے ارد گرد جمع کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سمرہ بن جندب کو بھی اپنے حلقہ احباب میں شامل کر لیا اور اسے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ درج ذیل مشہور آیت کی نسبت امیر المومنین علیؑ کی طرف دے دو۔ وہ آیت یہ ہے: ومن الناس من یُعجبک قولہ فی الحیاۃ الدنیا ویشھد اللہ علی ما فی قلبہ وھو الد الخصام[1] یعنی کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ دنیا کے بارے میں بولتے ہیں تو دنیا کی مذمت میں ان کی باتیں تجھے تعجب میں ڈال دیتی ہیں اور وہ باتیں تمھیں بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ ریاکاری کرتے ہیں۔ دنیا کے مذمت میں نہج

---

[1] سورہ بقرہ، آیت ۲۰۴ (انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ دنیا کی مذمت کے بارے میں ان کی باتیں آپ کو بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ بدترین دشمن ہیں۔)

البلاغہ میں موجود امیر المومنین امام علیؑ کے اس فصیح و بلیغ خطبے کے مقابلے میں جو انتہائی پر اثر ہے امیر شام نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔

آپ دیکھیے کہ آج بھی اگر کوئی شخص فصیح و بلیغ گفتگو کرتا ہے، کوئی شعر کہتا ہے یا کوئی کتاب لکھتا ہے اور کسی مطلب کو خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے تو فطری سی بات ہے کہ یہ کام لوگوں میں مشہور ہو جاتا ہے اور اس لکھنے والے کو بھی لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اگرچہ امیر المومنین امام علیؑ کے کلام کا موازنہ آج کے کسی ادیب کے کلام کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپؑ کا کلام ایک نمونہ ہے۔ نہج البلاغہ تو اسلامی معارف اور اقدار کی ایک بے مثال شاہکار کتاب ہے۔ لوگوں کے درمیان امیر المومنین امام علیؑ کی شہرت کو معاویہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا لہٰذا اس نے امیر المومنینؑ کے دنیا کی مذمت اور زہد و تقویٰ پر مبنی خطبے کے مقابلے آپؑ کے خلافی سازش کرنا چاہی اور سمرہ سے کہا کہ تم لوگوں میں جا کر کہو کہ مذکورہ بالا آیت امیر المو عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی امیر المومنین امام علیؑ جو دنیا کی مذمت میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو تجھے تعجب ہونے لگتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ خود دنیا دار اور ایک لالچی انسان ہیں (نعوذ باللہ)، لہٰذا یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی درج ذیل آیت: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ[1] اور لوگوں میں ایک آدمی ایسا بھی ہیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتا ہے" کے بارے میں اس سے کہا گیا کہ تم یہ کہو یہ آیت عبد الرحمان ابن ملجم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی معاویہ کو بہت ضرورت تھی کیونکہ وہ اس سے بہت فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۰۷

پیغمبر اکرم ﷺ کا ایک صحابی جس نے متعدد جنگوں میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ شرکت کی ہو (جیسا کہ سمرہ بن جندب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بچپنے ہی سے ایک جنگجو سپاہی تھا اور بالغ ہونے سے پہلے ہی کئی جنگوں میں حصہ لے چکا تھا۔ اس شخص کا ایک رخ یہ بھی تھا) اور آپ ﷺ کے اصحاب میں سے بھی تھا، اس شخص سے کہا گیا کہ مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس کی نسبت امیر المومنینؑ کی طرف دو اور کہہ دو کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

سمرہ بن جندب ایک انتہائی برا اور شقی آدمی تھا لیکن اس کے باوجود اس کا ضمیر اس کام کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس نے کہا نہیں! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ جو شخص معاویہ اور سمرہ بن جندب کے درمیان واسطہ تھا اس نے سمرہ سے کہا تمہیں تمہارا پورا حق ملے گا تم پیسوں کی فکر مت کرو۔ اس کام کے بدلے میں پچاس ہزار درہم دیئے جائیں گے۔ اس زمانے میں پچاس ہزار درہم ایک بہت بڑی رقم تھی۔ پچاس ہزار چاندنی کے سکے پانچ ہزار سونے کے سکوں کے برابر تھے۔ اس زمانے کے حساب سے اتنی بڑی رقم کی پیش کش، لیکن اس نے کہا مجھے قبول نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہے کہ سمرہ بہانہ بازی کر رہا تھا اور اس طرح وہ مزید رقم نکلوانا چاہتا تھا، ایسا نہیں تھا کہ اس کا ضمیر اسے اس کام سے روک رہا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ معاویہ کو اس کی ضرورت ہے اس لیے وہ چال بازی کر رہا تھا۔ بہر حال مجھے نہیں معلوم وہ ڈھکوسلہ کر رہا تھا یا اس کا ضمیر اسے اس کام سے روک رہا تھا ، میں سمرہ جیسے شخص کے گناہوں کو اپنے گردن پر لینا نہیں چاہتا۔ الغرض جب اس نے انکار کیا تو معاویہ کی طرف سے قیمت بڑھاتے ہوئے ایک لاکھ درہم کر دی گئی لیکن جب اس نے پھر بھی نہیں مانا تو قیمت دو لاکھ کر دی گئی لیکن اس نے پھر بھی قبول نہیں کیا۔ قیمت بڑھاتے بڑھاتے تین لاکھ یا پانچ لاکھ تک کی پیش کش کی گئی کہ جو

ایک بہت بڑی اور نا قابل تصور رقم تھی، لیکن اس نے پھر بھی قبول نہیں کیا۔ معاویہ نے اس شخص سے جو اس کے اور سمرہ کے درمیان واسطہ تھا کہا: اس بے وقوف کو معلوم نہیں کہ پانچ لاکھ درہم کتنے ہوتے ہیں۔ اس نے کہا پانچ لاکھ درہم یہاں لائے جائیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ یہ کتنی بڑی رقم ہے؟ پھر دیکھتے ہیں یہ قبول کرتا ہے یا نہیں؟ معاویہ نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ خزانہ سے پانچ لاکھ درہم نکال کر یہاں لائے جائیں۔ اس زمانہ میں چاندی کے سکے ہوتے تھے جنہیں تھیلیوں میں رکھا جاتا تھا جن کا حجم بہت بڑا ہوتا تھا۔ (خزانچی) مزدوروں کے ذریعے درہم کی تھیلیاں لاتا گیا اور ایک دوسرے کے اوپر رکھتا گیا یہاں تک کہ وہ تھیلیاں کمرے کی چھت تک پہنچ گئیں۔ اس کے بعد سمرہ سے کہا گیا کہ یہ ہیں پانچ لاکھ درہم۔ اب بتاؤ تمہیں قبول ہے کہ نہیں؟ جب اس نے درہموں بھری اُن تھلیوں کی طرف دیکھا تو معاملہ کو قبول کر لیا اور معاویہ کہ خواہش کے مطابق کی گئی اس آیت کی تفسیر کتابوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ بعد میں علماء کرام نے دنیائے اسلام سے اس قسم کی بے ہودہ اور فضول باتوں کا خاتمہ کر دیا لیکن پھر بھی بعض لوگوں کے ذہنوں میں اس کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہے۔ یہ وہ کارنامہ تھا جسے امیر شام نے انجام دیا تھا اور یہی اس کی پروپگینڈہ مہم کا ایک اہم حصہ تھا جسے وہ اپنی حکومت کے لیے ناگزیر سمجھتا تھا۔

حق کی تحریک کا طریقہ کار:

باطل کی اس یلغار کے مقابلے میں حق کی تحریک بھی خاموش نہیں بیٹھی (بلکہ) اس نے بھی کچھ طریقہ کار اپنائے۔ بطور خلاصہ وہ طریقے درج ذیل ہیں:

پہلا بھرپور طاقت کے ساتھ استقامت و پائیداری: بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید امام حسن مجتبیٰؑ جنگ سے ڈر گئے تھے۔ لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ امام حسنؑ جنگ کے لیے بالکل تیار تھے

۔ آپؑ کا شمار عرب کے بہادر لوگوں میں ہوتا ہے۔ مختلف کتابوں میں آپؑ کی شجاعت اور بہادری کے بے شمار واقعات بھرے پڑے ہیں۔

البتہ امیر المومنینؑ کے دور میں لڑی جانے والی جنگوں میں آپؑ میدان جنگ میں جانا چاہتے تھے تو خود امیر المومنین آپؑ کو جنگ کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ حضرت علیؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ امام حسن اور امام حسینؑ میدان جنگ میں جائیں اور اپنے لیے خطرات مول لیں۔ بعض لوگوں نے جب امیر المومنین امام علیؑ سے اس سلسلے میں پوچھا کہ محمد بن حنفیہ بھی تو آپ ہی کے بیٹے ہیں لیکن آپ انہیں میدان جنگ میں بھیجتے ہیں لیکن حسنینؑ کو اجازت نہیں دیتے؟ آپ نے فرمایا میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں پیغمبر اسلام ﷺ کی نسل ختم نہ ہو جائے کیونکہ یہ دونوں آپؐ کے وارث ہیں لہٰذا میں ان کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ بس اسی وجہ سے امیر المومنینؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو میدان جنگ میں بھیجنے سے ہچکچاتے تھے نہ اپنی اولاد ہونے کی وجہ سے کیونکہ آپؑ اپنے دوسرے بچوں سے بھی محبت کرتے تھے۔ خود امیر المومنینؑ بھی میدان جنگ کے ایک عظیم شہسوار اور خطرات مول لینے والے شجاع ترین آدمی تھے۔ آپؑ میدان جنگ سے گھبرانے والے کوئی عام انسان نہیں تھے لیکن چونکہ حسنینؑ پیغمبر اسلامؐ کے فرزند تھے لہٰذا امیر المومنینؑ اُن کی جان کو خطرے میں ڈالنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ امام علیؑ کے دور میں لڑی جانے والی تمام جنگوں میں حضرات حسنین علیہما السلام موجود ضرور ہوتے تھے لیکن انہوں زیادہ تلوار نہیں چلائی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے بہادروں میں ان حضرات کے نام نہیں ہیں لیکن اس کے علاوہ ایرانیوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں امام حسنؑ شریک تھے۔ اسی طرح جب معترضین نے حضرت عثمان کے گھر پر دھاوا بول دیا تھا تو امیر المومنینؑ کے حکم سے خلیفہ کے گھر کا دفاع کرنے والوں میں آپؑ پیش پیش تھے۔ اس کے علاوہ

بھی بے شمار اہم مواقع پر امام حسن مجتبیؑ نے اپنالوہا منوایا ہے، خود، جمل اور صفین کی جنگوں میں بھی آپؑ کا بے مثال کردار رہا ہے کیونکہ آپؑ کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داریاں عائد تھیں۔ میں نے ان دونوں جنگوں (جمل اور صفین) کے واقعات میں امام حسن مجتبیؑ کا تذکرہ زیادہ جبکہ امام حسینؑ کا کم دیکھا ہے۔یعنی امام حسینؑ کے مقابلے میں امام حسنؑ نے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا ہے۔جی ہاں! آپؑ ایک مجاہد انسان، مدبر سیاستدان، فصیح و بلیغ خطیب، قومی شخصیت اور بحث و مناظرے کے ماہر تھے۔ انسان جب آپؑ کے ارشادات کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہی کیونکہ آپؑ کے فرامین انتہائی سخت اور دوٹوک ہیں۔

امام حسن مجتبیؑ نے معاویہ کے ساتھ صلح کے بعد ایسا دوٹوک اور واضح موقف اپنایا کہ ایسے دو ٹوک چبھنے والے کلمات امام علیؑ نے بھی ادا نہیں کیے ہیں۔ دشمن کے مقابلے میں امیر المؤمنینؑ کے فرامین میں ایسا دوٹوک موقف بہت ہی کم دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؑ کا سامنا ایسے بے شرم اور خبیث دشمن سے نہیں تھا جیسا امام حسن کا دشمن تھا۔ لہٰذا امام حسنؑ کے کام میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی، اگر تھی تو وہ اس زمانے کی شرائط میں کمی تھی۔ امام تو اپنی پوری طاقت کے ساتھ دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

دوسرا تبلیغ: حق پرستوں کے نزدیک تبلیغ کو بڑی اہمیت حاصل ہے البتہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ تبلیغ کے سلسلہ میں حق پرستوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ تبلیغ کے سارے ذرائع سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ صرف اور صرف حقائق کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگوں کے ذہنوں میں کچھ چیزیں موجود ہوتی ہیں اور لوگ انہیں چاہتے بھی ہیں ایسے موقع پر باطل قوتیں لوگوں کی خواہشات کے عین مطابق بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی ہیں لیکن حق پرست ایسا نہیں کرتے وہ صرف حقائق بیان کرتے ہیں اگر چہ وہ

لوگوں کے لئے تلخ ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ ملاحظہ کریں کبھی کبھار امیر المومنینؑ اپنے قریبی دوستوں سے ایسے تلخ لہجے میں بات کرتے ہیں کہ انسان تعجب کرنے لگتا ہے اور ہم جیسے لوگ جو امیر المومنینؑ کی سیرت کو اپنانا چاہتے ہیں اس کے باوجود بعض موارد ہمارے لئے بھی تعجب انگیز ہیں۔

معاویہ کبھی ایسا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ لوگوں کی خواہش کے مطابق بات کرتا تھا۔ (کیونکہ) اس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی طریقے سے لوگوں کی توجہ اور حمایت حاصل کرے۔ امیر المومنینؑ یہ کام نہیں کرتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ آپؑ کو ایسا کرنا آتا نہیں ہو، بلکہ آپؑ اس لئے لوگوں کی خواہش کے مطابق بات نہیں کرتے تھے کہ یہ تقویٰ اور دین کے اصولوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا آپؑ فرماتے ہیں: لولا التقی لکنت ادھی العرب"[1] اگر تقویٰ کی بات نہ ہوتی، اقدار کا لحاظ نہ ہوتا تو ایسے کاموں میں، میں معاویہ سے کہیں زیادہ چالاک ہوتا اور یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ آپؑ کی خاندانی بنیاد، پیغمبر اسلام ﷺ سے آپؑ کے قدیمی اور قلبی تعلقات، آپؑ کے عظیم کارنامے، آپؑ کی عظیم روح کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ معاویہ سے کہیں زیادہ زیرک اور ہوشیار تھے۔ آپؑ بہت کچھ کر بھی سکتے تھے لیکن حق آپؑ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

دوسرا طریقہ: اقدار کی حفاظت کی تاکید ہے۔ یعنی حق پرستوں کے نزدیک جس چیز کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور جس چیز کو وہ عملی طور پر بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ ہر قیمت پر اقدار کی حفاظت ہے۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے انہیں ظاہری طور پر پیچھے ہی کیوں نہ ہٹ جانا پڑے

---

[1] الکافی، ج۱، ص ۲۴

۔ اس چیز پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، یعنی حق پرست دیکھتا ہے کہ اس کے قیام سے پورے نظرئے کو خطرات لاحق ہیں تو پھر وہ گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے وہ اس میں عار محسوس نہیں کرتا۔ جیسا کہ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کا فرمان ہے:

اَلْمَوتُ خَيْرٌ مِنْ رُكُوبِ الْعَارِ وَالْعَارُ خَيْرٌ مِنْ دُخُولِ النَّارِ[1]

ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے اور جہنم میں جانے سے (ظاہری) ذلت بہتر ہے۔ یعنی اگر مجھے ذلت کو قبول کرنا پڑے تو کروں گا کیونکہ یہ آتش دوزخ میں داخل ہونے سے کہیں بہتر ہے۔ بعض مقامات پر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بعض کاموں کو انجام دیتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں اور ان سے بچنے کے لیے عذاب الٰہی کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ شرم کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ انسان، اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کرے اور اپنی ذمہ داری نبھائے اگرچہ اسے اپنی بات، اپنے نظرئے اور موقف سے پیچھے ہی کیوں نہ ہٹنا پڑے۔ اور یہ کام اللہ تعالی کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے ہو۔

آپ ملاحظہ کیجیے کہ یہ آئمہ معصو علیہم السلام کی زندگی کا ایک بنیادی قانون ہے۔ امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی میں بھی یہ چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ امام حسنؑ نا مواقف حالات کی وجہ سے معاویہ کے ساتھ صلح پر مجبور ہوئے جبکہ اس وقت تک آپؑ مسلسل لشکر پر لشکر روانہ کر رہے تھے، لوگوں کو جنگ کے لئے تیار کر رہے تھے، لوگوں کو اپنے لشکر میں شامل کر رہے تھے، خطوط پر خطوط لکھ رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ دشمن کے ساتھ جنگ میں جن کاموں کی ضرورت ہوتی ہے انہیں مسلسل انجام دے رہے تھے۔ لیکن جب آپؑ نے دیکھا کہ یہ جنگ جیت نہیں سکتے تو پھر آپؑ

---

[1] بحالانوار، ج۷۵، ص۱۲۸

نے صلح کو قبول کیا۔ جس کی وجہ سے آپؑ کے بہت سے قریبی ساتھیوں نے آپؑ سے علیحدگی اختیار کر لی۔

جب امام حسنؑ نے صلح کی تو بہت سے لوگ دل ہی دل میں خوش ہوئے کیونکہ وہ دل سے اس جنگ سے خوش نہیں تھے لیکن یہی لوگ جن کی صلح کے ساتھ دل کی مراد بر آئی تھی امامؑ کی خدمت میں پہنچ گئے اور آپؑ کو نا سزا کہنا شروع کیا، وہ کہنے لگے آقا! آپؑ اپنے موقف سے کیوں پیچھے ہٹے؟ امام حسنؑ کے قریبی ساتھی یہاں تک کہ بعض بزرگان بھی جن کا میں نام لینا نہیں چاہتا جن کا شمار حضور اکرم ﷺ کے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے وہ آئے اور آپؑ کو ناسزا کہتے ہوئے آپؑ کو طرح طرح کے برے القابات سے نوازنے لگے۔ لیکن آپؑ نے عقب نشینی اختیار کی۔

حق پرستوں کی تحریک کی شکست کا تجزیہ:

اگلا مرحلہ حق پرستوں کی تحریک کی شکست کا تجزیہ ہے۔ امام حسنؑ کی شکست کی اصلی وجہ اور سبب عمومی بصیرت کی کمزوری اور لوگوں میں ایمان اور مادی خواہشات کی ملاوٹ تھی۔ حق یہ ہے کہ عمومی سوچ اور غور و فکر کے حوالے سے اس وقت کے لوگ بالکل نا آگاہ اور جاہل تھے ۔لوگوں کے دینی عقائد بھی دنیاوی خواہشات کے ساتھ گھل مل چکے تھے۔ ان کی نظر میں اصل چیز مال و دولت تھی اور (صلح امام حسنؑ) کے واقعہ سے کوئی دس بیس سال پہلے ہی (انسانیت کی) قدریں متزلزل ہو چکی تھیں۔ یہ سب چیزیں باعث بنیں کہ امامؑ مزاحمت کو جاری نہ رکھ سکیں۔

فاتح گروہ کا شکست کھانے والے گروہ کے ساتھ رویہ یہ تھا کہ انہوں نے امام حسنؑ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈالنے اور انہیں قتل کر دینے کے بجائے ظاہری طور پر

امام حسنؑ اور ان کے ساتھیوں کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھا۔ انہوں نے امام حسنؑ کے ساتھ ملاقات کی اور اس دوران بھی آپ کے احترام کا خاص خیال رکھا گیا۔ لیکن معاویہ اور اس کے ساتھیوں نے دل میں یہ قصد کیا ہوا تھا کہ کسی بھی طریقے سے امام حسنؑ کی شخصیت کو کمزور کر کے ختم کریں گے، یہی وجہ ہے وہ امام حسنؑ کا اس لیے احترام کرتا تھا کہ آپ کی شخصیت کو ختم کر سکے۔ اس کا یہی طریقہ تھا جیسا کہ عرض کیا اس نے اس بات کو اپنی پروپیگنڈہ مہم کا اصلی محور قرار دیا تھا۔

لیکن مغلوب گروہ نے فاتح گروہ کے ساتھ کیا کیا؟ انہوں نے اپنی پالیسی اور حکمت عملی اس طرح بنائی کہ اس فتنہ آمیز، گرد آلود، انتہائی خطرناک اور زہر آلود ماحول میں بھی حق کی ایک تحریک کو منظم کر سکیں اور اسے دین اسلام کے اصلی ستون کی مانند مستحکم کر سکیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ہم پورے معاشرے کو صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آگے نہیں لے جا سکتے تو پھر ایسی صورتحال میں ایک اپاہج تحریک چلانے کے بجائے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی لیکن ایک منظم اور نظریاتی تنظیم بنائی جائے تاکہ وہ باقی رہے اور دین اسلام کی بنیادی تعلیمات کی حفاظت کر سکے۔

اس کام کو امام حسنؑ نے انجام دیا آپؑ نے محدود پیمانے پر ایک تحریک کا آغاز کیا یا دوسرے الفاظ میں ایک جماعت کی بنیاد رکھی جس کے ارکان آئمہؑ کے اصحاب تھے۔ یہی تشیع کی تحریک تھی جس نے پوری تاریخ میں بدترین اور خطرناک حالات میں بھی آگے بڑھ کر دین اسلام کی بقا کے لئے کردار ادا کیا ہے۔ یہ تحریک نہ ہوتی تو پھر کب کا سب کچھ بدل چکا ہوتا۔ یہ امامت اور آئمہ معصومینؑ کی تحریک ہی ہے جس نے حقیقی اسلام کو بچا کر رکھا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ غلبہ پانے والے فاتحین اور طاقتور، محکوم بن کر رہ گئے اور مغلوبین، کمزور لوگ دنیائے اسلام کے لوگوں کے ذہنوں اور دلوں پر حاکم بن گئے۔ اگر آج آپ عالم اسلام کی ذہنیت اور اسکی سوچ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ تقریباً وہی ذہنیت ہے کہ جس کی ترویج امام علیؑ اور امام حسنؑ کیا کرتے تھے۔ آج اُس ذہنیت کے طرفدار مشکل ہی سے ملتے ہیں کہ جس کی ترویج معاویہ، یزید، عبدالملک بن مروان اور دوسرے خلفاء بنی امیہ کیا کرتے تھے۔ انکی سوچ اور فکر کا کوئی نام رکھنا چاہیں تو یہ مٹھی بھر ناصبی ہیں۔

نواصب:

ایک فرقے کا نام ہے عالم اسلام میں آج اس کا کوئی ظاہری وجود نہیں ہے۔ ناصبی وہی لوگ تھے جو پیغمبر اکرم ﷺ اور ان کے اہل بیت اطہارؑ کو ناز یبا، ناروا اور ناسزا کہا کرتے تھے۔ اگر معاویہ فاتح اور حاکم ہوتا تو آج عالم اسلام میں ان کی سوچ اور فکر کا دور دورہ ہوتا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس آج عالم اسلام پر امیر المومنینؑ اور امام حسن مجتبیٰؑ کی سوچ حاکم ہے۔ اگرچہ بعض فروعی مسائل اور کچھ عقائد جنہیں ثانوی حیثیت حاصل ہے مکمل طور پر اصلی حالت میں منتقل نہیں ہوئے لیکن مجموعی طور پر ان کی سوچ غالب ہے۔ بنابرایں امام حسن مجتبیٰؑ فاتح ہیں اور آپؑ کی جماعت کامیاب ہوئی۔ یہ پوری تاریخ اسلام پر صلح امام حسنؑ کے واقعے کے اثرات کے جائزے کا ایک خلاصہ تھا۔

چھٹا باب: حضرت امام حسن علیہ السلام

اسلام کو در پیش ممکنہ خطرات جو اس کے ظہور سے پہلے یا ظہور کے آغاز سے لاحق تھے، اللہ تعالی کی طرف سے پہلے ہی سے ان کا سد باب کیا گیا اور ان خطرات سے مقابلے کے وسائل کا خود اسلام اور اس کے قوانین میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ بالکل ایک صحیح و سالم جسم کی مانند جس کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ مدافعت عنایت کی ہے یا ایک ایسی مشین کی طرح جس کے بنانے والے انجنیئر نے اس کی مرمت کا سامان خود اس کے اندر ہی رکھ دیا ہو۔

اسلام قدرت کا ایک مظہر ہے اور دیگر مظاہر کی طرح اسے بھی مختلف قسم کے خطرات در پیش ہیں لہٰذا اسے ان خطرات سے مقابلے کے لئے وسائل کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالی نے ان وسائل کو خود اسلام کے اندر رکھا ہے۔ لیکن (سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ) وہ خطرات کیا ہیں؟ اسلام کو دو مخصوص قسم کے خطرات در پیش تھے ان میں سے ایک بیرونی دشمن کا خطرہ اور دوسرا اندرونی انتشار کا خطرہ تھا۔

بیرونی دشمن سے مراد وہ عناصر ہیں جو سرحدوں کے باہر سے مختلف اسلحوں سے لیس ہو کر کسی نظام کے وجود، اس کی فکر اور اس کی اعتقادی بنیادوں، اس کے قوانین اور دیگر تمام چیزوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ سرحدوں کے باہر سے یعنی کیا؟ اس سے مراد ملکی سرحدیں نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد نظام سے باہر کی چیزیں ہیں۔ چاہے وہ ملک کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ (ہر ملک کے) بعض دشمن ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اس ملک کے نظام سے لاتعلق سمجھتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ وہ اجنبی لوگ ہوتے ہیں جو کسی بھی نظام کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جدید ترین اسلحہ، پروپیگنڈوں، مال و دولت اور دیگر مختلف اقسام کے دستیاب وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ دشمن کی ایک قسم ہے۔

دوسرا دشمن اور آفت کسی نظام کا اندرونی طور پر انتشار کا شکار ہونا ہے یعنی نظام کے اندر انتشار پیدا کرنا، یہ غیروں کا کام نہیں بلکہ یہ اپنوں کا کام ہوتا ہے۔ اپنے لوگ ہی کسی نظام میں رہتے ہوئے اس نظام سے اکتا جانے، سمجھنے میں غلطی کرنے، خواہشات کے غلبہ یا مادی جلووں کے اسیر ہو جانے کی وجہ سے اندرونی طور پر اس آفت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پہلے والے دشمن کے مقابلے میں یہ دشمن زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔

یہ دونوں قسم کے دشمن یعنی بیرونی اور اندرونی دشمن کسی بھی نظام، تنظیم اور مظہر کے مقابلے میں موجود ہوتے ہیں لہٰذا اسلام نے ان دونوں قسم کے دشمنوں سے نمٹنے کے لئے "جہاد" کو ان کا علاج قرار دیا ہے جو صرف بیرونی دشمن کے لئے نہیں بلکہ ارشاد الٰہی ہے: جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ[1] منافق ہمیشہ کسی نظام کے اندر ہوتا ہے لہٰذا ان سب سے جہاد کرنا چاہیے۔ جہاد ہمیشہ اس شخص سے کیا جاتا ہے جو نظام پر یقین نہ رکھنے اور اسے دشمن سمجھنے کی وجہ سے اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اسی طرح اندرونی انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا مقابلہ کرنے کے لئے بے شمار قیمتی اخلاقی تعلیمات موجود ہیں جو دنیا کی حقیقت سے انسان کو آگاہ اور خبردار کرتی ہیں۔ اِعلمُو انّمَا الحیَاۃُ الدّنیَا لَعِب وَلَھو وَزِینَۃ وَتَفَاخُر بَینَکُم وتَکَاثُر فِي الاَموَالِ وَالاَولادِ[2] یعنی اگرچہ یہ دنیوی مال و دولت، یہ آرائشی اشیاء، یہ دنیوی لذتیں ہمارے لئے ضروری ہیں کیونکہ ان سے استفادہ کرنا ہماری مجبوری ہے اس لئے کہ ہماری زندگی انہی سے وابستہ ہے اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہمیں چاہیے کہ انہیں اپنے لئے حاصل کریں، لیکن یاد رکھیں کہ صرف انہی

---

[1] توبہ / ۷۳ (اے رسول! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے۔)

[2] حدید / ۲۰ (یاد رکھو کہ زندگی دنیا صرف ایک کھیل تماشا، آرائش، باہمی تفاخر اور اموال و اولاد کی کثرت کا مقابلہ ہے۔)

کو ہدف قرار دیتے ہوئے آنکھیں بند کر کے ان ضروریات کے پیچھے چلے جانا اور اپنے اصلی ہدف کو بھول جانا انتہائی خطرناک ہے۔ امیر المومنینؑ جو میدان جنگ کے شیر تھے جب گفتگو کرتے ہیں تو انسان یہ توقع کرتا تھا کہ آپؑ کی آدھی سے زیادہ گفتگو جہاد، جنگ اور جنگجوئی سے متعلق ہو گی، لیکن جب ہم ان سے منقول روایات اور نہج البلاغہ کے خطبات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی زیادہ تر گفتگو نصیحتوں، زہد و تقویٰ، اخلاقیات، دنیا کی نفی، اس کی تحقیر اور اعلیٰ انسانی اقدار اور معنویات کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے بارے میں ہے۔

امام حسینؑ کی زندگی کے حالات و واقعات میں یہ دونوں پہلو آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ یہاں نفس اور دشمن دونوں کے خلاف جہاد بہترین اور اعلیٰ درجے میں دیکھا جا سکتا ہے ۔واقعہ عاشورا کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ حادثہ پیش آئے گا اور پوری انسانیت کے لئے ایک بہترین مثال اور نمونہ بن جائے گا اور یہ نمونہ سب کے لئے طریقہ عمل کو بیان کرے گا جیسے مختلف ممالک میں مختلف شعبوں میں فاتح قرار پانے والے افراد اس شعبے میں دوسرے افراد کی ترغیب کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ ذہنوں کو حقیقت سے قریب لانے کے لئے ایک چھوٹی سی مثال ہے جبکہ عاشورا کا واقعہ ان دونوں محاذوں پر لڑی جانے والی عظیم ترین جنگ سے عبارت ہے۔ پہلا محاذ بیرونی دشمن سے جنگ کا محاذ ہے جو اس زمانے کے باطل نظامِ خلافت اور نظامِ سلطنت سے چمٹے ہوئے دنیا طلب لوگوں سے لڑی گئی۔ وہ لوگ جو پیغمبر اسلام ﷺ کے انسانوں کی نجات کے لئے لائے ہوئے بہترین نظام کو چھوڑ کر آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے کے بالکل مخالف سمت پر چلنا چاہتے تھے۔ دوسرا محاذ یعنی اندرونی طور پر لڑی گئی جنگ کیونکہ اس دور کے معاشرے کی عمومی صورت حال یہ تھی کہ پورا معاشرہ نفسانی خواہشات پر عمل کرتے ہوئے اس اندرونی فساد کی جانب چل پڑا تھا۔

دوسرا نکتہ میری نظر میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسلامی نظام حکومت کی تشکیل کو ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا۔ اوائل اسلام کی سختیوں اور مشکلات کا زمانہ گزر چکا تھا۔ فتوحات کے نتیجے میں خوب مال غنیمت حاصل ہو گیا تھا، اسلامی مملکت کا دائرہ وسیع تر ہو چکا تھا، بیرونی دشمنوں کی جگہ جگہ سرکوبی کر دی گئی تھی، بے شمار غنائم لوگوں کے ہاتھ لگ چکے تھے، بعض لوگ مالدار بن گئے تھے تو کچھ لوگوں کا شمار اشراف میں ہونے لگا تھا یعنی ابھی اسلام نے اشرافیت کا خاتمہ کیا ہی تھا کہ ادھر دنیائے اسلام میں ایک جدید اشرافی طبقے نے جنم لے لیا۔ بہت سے عناصر نے خود اسلام اور مختلف اسلامی عناوین جیسے فلاں صحابی کا بیٹا، پیغمبر اکرم ﷺ کے فلاں رشتہ دار کا بیٹا، کی بنیاد پر ناشائستہ اور غیر مناسب کاموں کو انجام دینا شروع کر دیا تھا جن میں سے بعض افراد کے نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی بیٹیوں کے حق مہر کو، مہر السنہ جسے پیغمبر اسلام ﷺ، امیر المومنینؑ اور صدر اول کے مسلمانوں نے چار سو اسی درہم معین کیا تھا، کے بجائے دس لاکھ دینار، دس لاکھ مثقال خالص سونا قرار دیا! یہ کون لوگ تھے؟ یہ حضور اکرم ﷺ کے بڑے بڑے صحابیوں کے بیٹے مثلاً مصعب ابن زبیر جیسے لوگ تھے۔

اس قسم کے حالات پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے ایک عشرے سے بھی کم عرصے میں پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اسلام کے سابقہ دار، چاہے وہ آپ کے ابتدائی ساتھی ہوں یا جنگوں میں شریک ساتھی، وہ اپنے لیے خاص حق کے قائل ہو گئے تھے ۔ ان مراعات میں سے ایک، بیت المال سے زیادہ سے زیادہ مال وصول کرنا تھا۔ ایسا ماحول بنایا گیا کہ ان کو دوسروں کے برابر سمجھنا صحیح نہیں ہے یعنی یہ لوگ دوسروں کے برابر نہیں ہو سکتے! یہ اس کج روی کی پہلی اینٹ تھی۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے انحرافات میں آہستہ آہستہ تیزی آنا شروع ہوئی اور یہیں

سے انحرافات پیدا ہونا شروع ہو گئے اور خلیفہ سوم کے دور حکومت کے وسط تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور ان کے دور حکومت میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پیغمبر اسلامؐ کے (بعض) نمایاں صحابہ کرام کا شمار اپنے زمانے کے بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا! آپ غور فرمائیں یعنی بڑے بڑے صحابہ کرام جن کے نام بھی مشہور ہیں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص وغیرہ کے ان میں سے ہر ایک کے اگر جنگ بدر، جنگ حنین، اور جنگ احد کے کارنامے لکھے جائیں تو ایک اچھی خاصی کتاب بن جائے گئی۔ اب انکا شمار عالم اسلام کے بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا تھا۔

ان میں سے ایک کا جب انتقال ہوا اور اس کی جائیداد میں سے سونے کو اس کے ورثا کے درمیان تقسیم کرنے کا مرحلہ آیا تو سب سے پہلے سونے کو اینٹوں میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کے بعد ان اینٹوں کو کوئلے کی طرح کلہاڑیوں کے ذریعے چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں توڑا گیا! جبکہ اصولاً سونے کو سنگ مثقال (سونا کاٹنے کا آلہ) کے ذریعے کاٹا جاتا ہے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ ان کے پاس کتنا سونا ہو گا کہ جسے کلہاڑیوں کے ذریعے کاٹا گیا ہو! یہ وہ حقائق ہیں کہ جو تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ ایسی باتیں نہیں ہیں کہ جن کے بارے میں کوئی یہ کہہ دے کہ یہ باتیں تو شیعوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جنہیں محفوظ کرنے کی سب نے کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کتنے درہم و دینار چھوڑے ، انکا کوئی حساب نہ تھا۔

جب ہم کسی نظام کی اندرونی خرابی کی بات کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ معاشرے میں ایسے افراد جنم لیتے ہیں جو آہستہ آہستہ اخلاقی بیماریوں جیسے مادہ پرستی اور شہوت پرستی جیسی مہلک بیماریوں کو معاشرے میں پھیلاتے ہیں۔ ایسے حالات میں کیا کوئی ایسا شخص پیدا ہو سکتا ہے جو شجاعت، بہادری اور جرات کے ساتھ یزید بن معاویہ کی حکومت کے خلاف

آواز بلند کر سکے ؟! کیا یہ ممکن ہے ؟ کیا کسی نے یزید کی ظالم اور جابر حکومت کے خلاف آواز حق بلند کرنے کا سوچا بھی تھا ؟ ایسے حالات میں امام حسینؑ نے قیام فرمایا اور اپنے ظاہری دشمن سے بھی جنگ کی اور عام مسلمانوں کو تباہی اور انحراف کی طرف لے جانے والی اندرونی برائیوں ،عیاشیوں اور راحت طلبی سے بھی جنگ کی۔ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔

قیام امام حسینؑ کے اہداف

اگر واقعہ کربلا کا بغور مطالعہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت اباعبد اللہ الحسینؑ کے چند مہینوں پر مشتمل سفر میں، اس دن سے لے کر کہ جب امامؑ نے مدینہ سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور مکہ سے ہوتے ہوئے سر زمین کربلا میں جام شہادت نوش فرمایا، انسان سو سے زیادہ درس عبرت کو شمار کر سکتا ہے۔ میں ہزاروں درس عبرت کہنا نہیں چاہتا البتہ کہا جا سکتا ہے کہ ہزاروں درس حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ممکن ہے امام عالی مقامؑ کا ہر ایک اشارہ ایک درس ہو لیکن یہ جو ہم نے عرض کیا ہے کہ سو سے زیادہ درس عبرت تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم امامؑ کے ان تمام اقدامات کو نہایت سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں تو ایسے سو عناوین اور ابواب اخذ کر سکتے ہے کہ جن میں سے ہر ایک باب ایک ملت، ایک پوری قوم اور ملک کی تعلیم اور تربیت اور معاشرتی اصلاح اور قرب خدا کے لئے ایک مکمل درس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے حسین ابن علیؑ کی شخصیت اور کردار دنیا کے تمام مقدس اور پاکیزہ افراد کے درمیان خورشید کی مانند روشن اور درخشاں ہے۔ آپ انبیا، اولیاء، آئمہ، شہدا اور صالحین کو دیکھ لیجیے اگر یہ چاند اور ستاروں کے مانند چمکتے ہیں تو امام عالی مقامؑ کی شخصیت سورج کی مانند تابناک ہے۔ لیکن جن سو دروس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ ایک طرف ، میں یہاں اس واقعے کے اصلی

درس کو آپ (قارئین کرام) کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کروں گا کیونکہ باقی تمام دروس کو ثانوی حیثیت حاصل ہے جبکہ اس اصلی درس کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام عالی مقامؑ نے قیام کیوں فرمایا تھا؟ یہ اصلی درس ہے،۔امام حسینؑ سے کہا گیا تھا کہ آپ کی شخصیت مدینہ اور مکہ میں قابل احترام ہے اور یمن میں بھی آپ کے شیعہ موجود ہے لہٰذا کسی کونے میں تشریف لے جایئے جہاں آپؑ کو یزید سے کوئی سروکار نہ ہو، اور نا ہی یزید کو آپ سے کوئی واسطہ ہو۔ آپؑ کے اتنے سارے چاہنے والے شیعہ ہیں، جایئے ان کے درمیان عزت و احترام کے ساتھ زندگی بسر کیجیے! آپؑ قیام کیوں کرتے ہے؟ مسئلہ کیا ہے؟ یہ ہے وہ اصلی اور بنیادی سوال اور یہ ہی اس واقعہ کا اصلی درس بھی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کسی نے ان مطالب کو آج تک بیان نہیں کیا۔ کیوں نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس حوالے سے بہت ہی محنت سے کام لیا گیا ہے اور باتیں بھی زیادہ ہوئی ہیں۔ لیکن ہم یہاں جو مطالب آپ کی خدمت میں بیان کرنے جارہے ہیں یہ خود ہماری نظر میں اس واقعہ کا ایک بالکل ہی نیا پہلو اور ایک نئی تحقیق ہے ۔بہت سے لوگ یہ کہتے ہے کہ امام حسینؑ یزید کی فاسد حکومت ختم کر کے خود ایک حکومت تشکیل دینا چاہتے تھے اور یہ ہی امام حسینؑ کے قیام کا مقصد تھا یہ بات کسی حد تک تو صحیح ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر اس نظریہ کا مقصد یہ ہے کہ امام حسینؑ نے تشکیل حکومت کے لیے قیام کیا تھا، پھر جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے مقصد تک پہنچ نہیں سکتے تو یہ کہہ کر انہیں واپس لوٹ جانا چاہیے تھا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے لہٰذا تحریک کو یہی ختم کر دیتے ہے! جی ہاں! جو شخص حکومت کی تشکیل کے لیے تحریک چلاتا ہے وہ اس حد تک کوشش کرتا ہے جہاں تک ممکن ہو لیکن جب اسے اس کام کے نہ ہونے کا یقین ہوتا ہے یا وہ عقلی طور پر مقصد تک جانے والی راہوں کو مسدود پاتا ہے تو

اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوٹ آئے۔ اگر مقصد حکومت کی تشکیل ہو تو پھر انسان اس حد تک آگے جاتا ہے جہاں تک ممکن ہو اور جہاں سے آگے بڑھنے کا امکان ختم ہو جائے تو پھر اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔

بنابرایں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیام امام حسینؑ کا مقصد اور ہدف صرف اور صرف حضرت علیؑ کی مانند ایک علوی حکومت کی تشکیل تھی تو یہ بات بالکل غلط ہے کیوں کہ امام عالی مقامؑ کی پوری تحریک اس نظریہ کی تائید نہیں کرتی۔ اس نظریہ کے مقابلے میں کچھ لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ امام حسینؑ کو حکومت سے کیا کرنا تھا؟ امام تو جانتے تھے کہ آپؑ حکومت نہیں بنا سکیں گے بلکہ وہ تو آئے ہی اس لیے تھے تا کہ قتل ہو کر شہادت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکیں! ایک زمانے میں یہ نظریہ بھی لوگوں میں بڑا مقبول تھا۔ بہت سے شعراء اس نظریہ کو اپنے خوبصورت اشعار کے قالب میں ڈھال کر بیان کرتے تھے یہاں تک کہ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے بعض بڑے بڑے علما نے بھی اس نظریہ کو بیان فرمایا ہے۔ یعنی امام حسینؑ کے قیام کا مقصد صرف اور صرف شہید ہونا تھا۔ لیکن حقیقت میں یہ کوئی نئی بات یا نیا نظریہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کے اس نظریہ کے مطابق گویا امامؑ نے یہ کہا کہ چلو ہم اگر زندہ رہ کر کچھ کر نہیں سکتے تو شہید ہو کر ہی کچھ کیے دیتے ہیں[1]۔ ہماری بنیادی تعلیمات میں ہمیں اس نظریئے کی تائید میں کوئی سند نہیں ملتی کہ

---

[1] یعنی اسلام اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا کہ بغیر کسی مقصد کے اپنی جان دے دو۔ جیسا کہ ہمیں توابین کی تحریک میں نظر آتا ہے کہ ان کا مقصد تھا مارو یا مر جاو گو کہ وہ انتقام خون حسین کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر ان پاس کوئی واضح حکمتِ عملی نہیں تھی لہٰذا اس طرح سے جان دے دینا اسلامی نقطہ نگاہ سے درست نہیں بلکہ ایک مقصد کے لئے جان دینا ارزش رکھتا ہے خون حسین کے انتقام میں خود مر جانا اہم نہیں بکہ ایسے اسباب فراہم کرنا کہ زیادہ سے زیادہ سود مند نتیجہ ہاتھ آئے اس کے بعد اس راہ میں اگر جان چلی بھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

جاؤ اور بغیر کسی وجہ کے شہید ہو جاؤ۔ اسلامی تعلیمات میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی ہے بلکہ شریعت مقدسہ، قرآن اور روایات میں ہمیں جس شہادت کا تذکرہ ملتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایک ایسے مقدس ہدف کی راہ میں جدوجہد کرے جو واجب یا مستحب ہو اور اگر اس راہ میں وہ قتل ہو جائے تو یہی صحیح شہادت ہے۔ لیکن اگر انسان صرف اس لئے قیام کرے تا کہ شہید ہو جائے ،شاعرانہ تعبیر کے مطابق اس لیے قدم بڑھائے تا کہ اس کے خون کا سیلاب ظالم کو بہا کر لے جائے اور انہیں زمین بوس کر دے تو یہ تمام چیزیں واقعہ کربلا کے اس عظیم حادثے سے کسی بھی طرح میل نہیں کھاتیں۔ اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت نے یہ کام کر دکھایا ہے لیکن آپؑ کے قیام کا مقصد یہ نہیں تھا[1]۔

مختصر یہ کہ نہ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں امام حسینؑ نے تشکیل حکومت کے لئے قیام کیا تھا اور آپؑ کا مقصد ایک حکومت بنانا تھا اور نہ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امامؑ نے شہید ہونے کے لئے قیام کیا تھا بلکہ آپؑ کا مقصد کچھ اور تھا۔ میری نظر میں مذکورہ دونوں نظریوں کے ماننے والوں نے ہدف اور نتیجہ کو آپس میں ملا دیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی امامؑ کا ہدف نہیں تھا بلکہ آپ کا ہدف ان سے الگ اور عظیم تھا البتہ اس ہدف تک پہنچنے کے لئے ایک تحریک کی ضرورت تھی جس کا نتیجہ ان دونوں میں سے کسی ایک صورت میں نکلنا لازمی تھا۔ یعنی یا حکومت یا شہادت۔

البتہ امام حسینؑ ان دونوں نتائج کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے تشکیل حکومت اور شہادت دونوں کے لئے تیاری کر رکھی تھی لہٰذا کوئی بھی نتیجہ نکلتا آپؑ کو کچھ فرق پڑنے والا نہیں تھا، کیونکہ آپؑ ذہنی طور پر دونوں میں سے کسی ایک نتیجے کو قبول کرنے کے لئے تیار تھے

[1] بلکہ یہ تو اس عظیم کام کے ثانوی نتائج تھے جو خواہ ناخواہ حاصل ہونے ہی تھے۔

لیکن تشکیل حکومت اور شہادت میں سے کوئی بھی آپؑ کا ہدف اور مقصد نہیں تھا بلکہ مقصد کچھ اور تھا۔

تو پھر امام عالی مقام کا ہدف کیا تھا؟ پہلے ہم اس ہدف کو مختصر ایک ہی جملے میں بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد اس کی مختصر سی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ اگر ہم امام حسینؑ کے قیام کا ہدف اور مقصد بیان کرنا چاہیں تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ آپؑ کا ہدف دینی واجبات میں سے ایک ایسے عظیم ترین واجب کو انجام دینا تھا جس کو امام حسینؑ سے پہلے کسی نے بھی انجام نہیں دیا تھا یہاں تک خود رسول اکرم ﷺ اور امیر المومنین امام علی اور امام حسن مجتبیٰؑ نے بھی انجام نہیں دیا تھا۔ وہ ایک ایسا واجب تھا جو اسلام کے عملی اور فکری نظام میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ وہ ایسا واجب تھا کہ بنیادی اہمیت کا حامل ہونے کے باوجود امام حسینؑ کے دور حیات تک اس پر عمل نہیں ہو سکا تھا۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اس پر کیوں عمل نہیں ہوا تھا۔ امام حسینؑ کو اس واجب پر عمل کرنا تھا تاکہ تاریخ میں سب کے لئے ایک درس بن جائے جس طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے اسلامی حکومت تشکیل دے کر پوری تاریخ کے لئے ایک درس چھوڑا تھا۔ آپؐ نے صرف احکام بیان نہیں کئے تھے بلکہ عملی طور پر ایک حکومت تشکیل دی تھی، یا آپؐ نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہ رویہ بھی تا ابد پوری تاریخ اسلام اور تاریخ بشریت کے لئے ایک درس بن گیا، اسی طرح اس واجب کو امام حسینؑ کے ذریعے انجام پانا تھا تاکہ پوری تاریخ کے مسلمانوں کے لئے ایک عملی درس بن سکے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کام کے لئے امام حسینؑ کو ہی کیوں منتخب کیا گیا؟ چونکہ اس واجب کو عملی جامہ پہنانے کا جو راستہ تھا وہ امام حسینؑ کے دور میں ہموار ہوا تھا اگر یہ راستہ امام حسینؑ کے دور میں ہموار نہ ہوتا مثلاً امام علی نقیؑ کے دور میں یہ راستہ ہموار ہوتا تو امام علی نقیؑ

اس کام کو انجام دیتے اور تاریخ اسلام میں اس عظیم واقعے اور ذبح عظیم کا محور قرار پاتے۔ اسی طرح اگر یہ راستہ امام حسن مجتبیٰؑ یا امام جعفر صادقؑ کے دور میں ہموار ہوتا ہے تو یہ ہستیاں بھی اسی طرح عمل کرتیں۔ امام حسینؑ سے پہلے ایسے حالات پیش نہیں آئے اور نہ امام حسینؑ کے بعد سے لیکر زمانہ غیبت تک تمام آئمہ معصومینؑ کے دور میں کبھی یہ حالات پیش آئے۔

پس ہدف اس واجب کو انجام دینے سے عبارت ہے۔ اب میں اس بات کی وضاحت بھی کرتا ہوں کہ یہ واجب کیا ہے؟ اس وقت اس واجب کی ادائیگی سے خود بخود ان دو میں سے ایک نتیجہ نکل سکتا ہے، یا تو اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ امام حسینؑ کو حکومت مل جائے گی، تو اہلاً و سھلاً، امامؑ پہلے سے ہی اس بات کے لئے تیار تھے، اگر امام حسینؑ کو حکومت مل جاتی تو آپؑ پوری طاقت اور قدرت کے ساتھ اسے اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور پورے معاشرے کو رسول اکرم ﷺ اور امیر المومنینؑ کی مانند چلاتے۔ اگر اس واجب پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ شہادت کی شکل میں جاتا ہے تب بھی امام حسینؑ اس کے لئے بھی پہلے ہی سے تیار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے امام حسینؑ اور دیگر آئمہ معصومینؑ کو اس طرح خلق فرمایا تھا کہ اس امر عظیم کے لئے پیش آنے والی اس خاص قسم کی شہادت کے بار سنگین کو اٹھا سکیں اور ان ہستیوں نے ان تمام مصائب اور مشکلات کو برداشت بھی کیا، البتہ کربلا میں مصائب کا پہلو اس واقعہ کا ایک دوسرا بڑا عظیم رخ ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کروں۔

پیغمبر اکرم ﷺ یا کوئی بھی رسول جب مبعوث ہوتا ہے تو اسلامی احکامات کا ایک مجموعہ لے کر آتا ہے، ان میں سے بعض احکامات انفرادی ہوتے ہیں تاکہ انسان اپنی اصلاح کرے اور بعض اجتماعی ہوتے ہیں تاکہ دنیائے بشر کی آبادکاری کی جائے، انسانوں کی صحیح سمت میں

رہنمائی کریں اور اسلامی معاشرے کو ایک صحیح نظام کے ذریعے قائم رکھیں۔ یہ انفرادی اور اجتماعی احکامات ایک مجموعہ کی شکل میں ہوتے ہیں کہ جنہیں اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

اسلام قلب مقدس رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوا اور آپؐ نے نماز، روزہ، زکات، انفاق، حج، گھر کے اندر کے احکامات، انفرادی رابطہ اور تعلقات، جہاد فی سبیل اللہ، تشکیل حکومت، اسلامی اقتصاد، حکمران اور عوام کا رابطہ اور حکومت کے حوالے سے عوام کی ذمہ داریاں وغیرہ ان تمام احکامات کو ایک مجموعہ کی شکل میں انسانیت کے سامنے پیش کیا اور سب لوگوں کے سامنے بیان فرمایا۔ یاایھا الناس واللہ ما من شیء یقربکم من الجنۃ ویباعدکم من النار الا وقد امرتکم بہ [1]۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان تمام چیزوں کو جو کسی انسان یا ایک انسانی معاشرے کو سعادت اور خوش بختی تک پہنچا سکتی ہیں، نہ صرف بیان کیا بلکہ ان پر بذات خود عمل بھی کیا اور اپنے معاشرے میں نافذ بھی کیا۔

اب جب پیغمبر اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ میں اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ تشکیل پا گیا، اسلامی اقتصادیات کو نافذ کر دیا گیا، اسلامی نظام جہاد قائم ہو چکا اور زکات کی ادائیگی معاشرے میں رائج ہو گئی اور روئے زمین پر ایک حقیقی اسلامی ملک اور اسلامی نظام حکومت نے جنم لے لیا، اب اس اسلامی نظام کو چلانے والے انجنیئر اور اس ریل گاڑی کو اس کی پٹڑی پر چلانے والے خود رسول اکرم ﷺ ہوں گے یا وہ ہو گا جو ان کی جگہ پر بیٹھے گا۔

---

[1] اے لوگوں! کوئی ایسی شی باقی نہیں رہی جو تمہیں جنت سے قریب اور جہنم سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تمھیں اس کا حکم نہ دیا ہو۔ (الکافی، ج ۲، ص ۷۴)

رسول اکرم صَلَّی‌اللّٰہُ‌عَلَیْہِ‌وَآلِہٖ‌وَسَلَّم کا بتایا ہوا راستہ واضح اور روشن ہے لہٰذا اس معاشرے اور اس سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو چاہیے کی اسی راستہ پر قدم اٹھائیں، اسی راستے پر آگے بڑھے اور اسی راستہ سے اپنے ہدف و مقصود تک پہنچے۔

اگر اسلامی معاشرہ اسی راستے پر اسی سمت کی طرف رواں دواں ہو تو اس وقت اس معاشرے سے تعلق رکھنے والے تمام انسان اپنے کمال تک پہنچ جائیں گے وہ نیک اور فرشتہ صفت بن جائیں گے۔ معاشرے سے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ معاشرے کو برائیوں، فساد، اختلافات ، فقر و افلاس اور جہالت کے منحوس اور مکروہ سائے سے نجات مل جائے گی، انسان اپنی کامل خوش بختی کو پالے گا اور خدا کا مقرب بندہ بن جائے گا۔

رسول اکرم صَلَّی‌اللّٰہُ‌عَلَیْہِ‌وَآلِہٖ‌وَسَلَّم کے ذریعے اسلام کو ایک ضابطہ حیات کی حیثیت سے لایا گیا اور وہ اس زمانے کے معاشرے میں نافذ ہوا لیکن کہاں؟ ایک شہر میں جسے مدینہ کہا جاتا ہے، اس کے بعد مکہ اور دیگر چند شہروں میں اس اسلامی نظام نے وسعت پائی۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کاروان کو کہ جسے خود رسول اکرم صَلَّی‌اللّٰہُ‌عَلَیْہِ‌وَآلِہٖ‌وَسَلَّم نے ایک معین راستے پر گامزن کر رکھا ہے اگر کوئی ہاتھ آگے بڑھنے سے روکے یا وہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس وقت لوگوں کی کیا ذمہ داری بنتی ہیں؟ اسی طرح اگر اسلامی معاشرہ منحرف ہو جائے اور یہ انحراف اس حد تک بڑھ جائے کہ پورے اسلام اور اسلامی تعلیمات کو لپیٹ میں لینے کا خوف ہو تو اس صورت میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ انحراف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک انحراف یہ ہے کہ لوگ خراب ہو جائیں۔ اکثر اوقات ایسا ہی ہوتا ہے لیکن لوگوں کے منحرف ہونے سے اسلامی تعلیمات ختم نہیں ہوتیں۔ دوسری قسم کا انحراف یہ ہے کہ لوگوں کے منحرف ہونے کے ساتھ حکومت ہی خراب ہو جائے اور علماء دین اور خطباء انحراف کا شکار ہو جائیں۔ ایسی صورت میں ان

منحرف لوگوں سے صحیح اور سالم دین کی توقع نہیں رکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات میں تحریف کرتے ہوئے اچھے کو برا اور برے کو اچھا، منکر کو معروف اور معروف کو منکر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کو اسلام کے بتائے ہوئے راستے سے ایک سو اسی درجہ الٹا پیش کرتے ہیں۔ اگر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام اس مشکل سے دوچار ہو جائے تو یہاں ذمہ داری کیا ہے ؟ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس سلسلہ میں ذمہ داری کو بیان کر دیا ہے اور قرآن نے بھی یہ فرمایا ہے: من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ[1] اس سلسلے میں آیات اور روایات بہت زیادہ ہیں لیکن یہاں پر امام حسینؑ کی زبانی ایک روایت بیان کرنا چاہتا ہوں جسے آپؑ نے پیغمبر اکرم کی زبانی نقل کیا ہے سوال یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ خود بھی اس حکم پر عمل کر سکتے تھے؟ نہیں۔ کیونکہ یہ حکم الٰہی اس وقت قابل عمل ہے جب معاشرہ منحرف ہو چکا ہو، اگر معاشرہ منحرف ہو جائے تو اس کا علاج کرنا چاہیے اور اس بارے میں اللہ تعالی نے ایک خاص حکم بھی جاری کیا ہے، ایسے معاشروں کے لئے کہا کہ اگر معاشرتی انحراف اور خرابی اس حد تک بڑھ جائے کہ یہ اصل اسلام اور اس کی تعلیمات سے انحراف کا سبب بنے تو اس صورت میں اللہ تعالی نے ایک حکم جاری کیا ہے، پس اللہ تعالی نے انسان کو کسی بھی مسئلے میں بغیر حکم کے نہیں چھوڑا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے خود اس حکم خدا کو بیان فرمایا ہے یعنی قرآن اور حدیث نے اس حکم کو بیان کیا ہے لیکن آپؐ خود اس حکم پر عمل نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ اس حکم پر تب عمل کیا جا

---

[1] مائدہ / ۵۴ (تم میں سے جو شخص اپنے دین سے مرتد ہو جائے تو اللہ ایسی قوم لیکر آئے گا کہ اللہ اس سے محبت کرے گا اور وہ قوم بھی اللہ سے محبت کرے گی۔)

سکتا ہے جب معاشرہ منحرف ہو جائے۔ رسول اکرم ﷺ کے عہد رسالت اور امیر المومنینؑ کے عہد ولایت وامامت میں مسلمان معاشرہ اتنا منحرف نہیں ہوا تھا کہ اس حکم پر عمل کرنے کی نوبت آتی، اسی طرح امام حسنؑ کے دور میں بھی جب ظاہری حکومت، معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور اس اجتماعی انحراف کی بہت سے نشانیاں ظاہر ہو گئی تھیں لیکن اس کے باوجود اس مرحلے تک نہیں پہنچی تھیں جہاں پورے اسلام کی نابودی کا خطرہ در پیش ہوتا، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاص زمانے میں ایسی کوئی صورتحال پیش آئی ہو لیکن اس وقت حکم الٰہی پر عمل کرنے کی فرصت نہ ملی ہو یا موقع مناسب نہ ہو۔ یہ حکم الٰہی جو اسلامی احکامات کا ایک جز ہے اور اس کی اہمیت خود حکومت سے کسی بھی طرح کم نہیں، اس لئے کہ حکومت کا مطلب ہے معاشرے کا بہترین نظام۔ اگر معاشرہ بتدریج اپنی راہ سے نکل کر خرابی کا شکار ہو جائے اور حکم خدا تبدیل ہو جائے اور ہمارے پاس اس خراب حالت کو بدلنے کیلئے کوئی حکم اور منصوبہ بندی موجود نہ ہو تو ایسی حکومت کا کیا فائدہ؟ پس معلوم ہوا کہ منحرف معاشرے کو اس کی اصلی راہ پر دوبارہ گامزن کرنے کے حکم کی اہمیت خود حکومت اور اور اس کی اہمیت سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس حکم کی اہمیت کفار سے جہاد کرنے سے بھی زیادہ ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس حکم کی اہمیت اسلامی معاشرے میں ایک معمولی قسم کے امر بالمعروف او رنہی عن المنکر سے بھی زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہے کہ شاید منحرف معاشرے کو اس کے راستے پر لوٹانے کا حکم اللہ تعالی کی طرف سے عظیم فرائض اور واجبات اور حج سے بھی زیادہ ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ در حقیقت یہ حکم فنا یا ختم ہونے کہ قریب پہنچے ہوئے اسلام کو زندہ کرنے کا ضامن ہے۔ اچھا تو پھر کون ہے جو اس اہم ترین حکم پر عمل کرے؟ اس عظیم حکم پر نبی اکرم ﷺ کا کوئی ایسا جانشین ہی عمل کر سکتا ہے جو ایسے زمانے میں موجود ہو جب

معاشرہ انحراف کا شکار ہو گیا ہو۔ البتہ اس کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ اس حکم پر عمل درآمد کے لئے حالات بھی ساز گار ہوں کیونکہ اللہ تعالی ایک ایسے عمل کو واجب نہیں کرتا جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ لہٰذا اگر حالات ناساز گار ہوں اور یہ جانشین نبی کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے، اس کے عمل اور جدوجہد کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ لہٰذا عمل درآمد کے لئے حالات کو مناسب اور موزوں ہونا چاہیے۔

حالات کے ساز گار ہونے کے معنی کچھ اور ہیں۔ یہ نہیں کہ ہم کہیں چونکہ اس حکم کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں خطرات موجود ہیں لہٰذا حالات ساز گار نہیں ہیں۔ حالات کے ساز گار ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ حالات اور شرائط کو مناسب ہونا چاہیے یعنی انسان یہ جانے کہ اگر اس نے کام کو انجام دیا تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ ظاہر ہو گا، یعنی لوگوں تک پیغام پہنچ جائے گا ،عوام اس کے نتیجے میں حقیقت کو سمجھے گی اور لاعلمی کے بحران سے نکل آئے گی۔ یہ وہ عظیم ذمہ داری ہے جسے کسی نہ کسی کو انجام دینا ضروری ہے۔

اب چونکہ امام حسینؑ کے زمانے میں یہ انحراف پیدا ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ حکم الٰہی پر عمل در آمد کے لئے راستہ بھی ہموار تھا لہٰذا امام حسینؑ کا قیام کرنا ضروری تھا کیونکہ انحرافات پیدا ہو چکے تھے[1]، معاویہ کے بعد ایک ایسا شخص صاحب اقتدار ہو چکا تھا جو اسلام کے ظاہری احکام کی ذرہ برابر بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔ وہ خلیفہ کہلانے کے ساتھ ساتھ شراب بھی پیتا تھا، جنسی گناہوں، دیگر برائیوں اور قبیح ترین اعمال کا علی الاعلان ارتکاب اس کی عادت تھی، قرآن کے

[1] گو کہ ان کا بیج بہت پہلے بویا گیا تھا مگر امام حسین علیہ السلام کے دور میں یہ حالات اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ اب خاموش بیٹھنا گویا امامت کی اصل ذمہ داری سے نظریں پھیرنا تھا۔

خلاف باتیں کرتا تھا اور قرآنی احکامات اور دینی تعلیمات کے خلاف اشعار کہتا تھا اور کھلم کھلا اسلامی احکام کی مخالفت کرتا تھا۔ چونکہ اس کا نام مسلمانوں کا خلیفہ پڑ گیا تھا اس لئے وہ اسلام کے نام کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہ تو اسلام کا پیرو کار تھا اور نہ ہی اسے اسلام سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اس کے دل میں اسلام کے لئے کوئی نرم گوشہ تھا، بلکہ وہ اپنے عمل میں ایسے گندے نالے کی مانند تھا جس میں مسلسل گندہ اور بد بو دار پانی بہتا ہے اور پورے ماحول کو بد بو دار کر دیتا ہے وہ بھی اپنے گندے اور بد بو دار اعمال کے ذریعے پورے اسلامی معاشرے کی فضا کو آلودہ اور بد بو دار کر رہا تھا۔ ایک برے اور فاسد حاکم کی مثال ایسی ہے۔ کیونکہ حاکم معاشرے میں سب سے اونچے منصب پر فائز ہوتا ہے لہٰذا جو کام بھی اس سے سرزد ہوتا ہے ہے وہ تنہا اس کی ذات تک نہیں رہتا بلکہ عوام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح اونچے مقام پر گندہ نالا ہو تو اس سے رسنے والا مواد نیچے کے علاقوں کو بھی اپنی گندگی اور غلاظت کا نشانہ بناتا ہے۔ عام افراد کے بر خلاف (کیونکہ ان کے اعمال اس خاصیت کے نہیں ہوتے ہیں) ان کا عمل انہیں تک محدود ہوتا ہے لیکن جس کا مرتبہ بلند ہو اور معاشرے میں بڑے درجے کا مالک ہو تو اس کی برائیوں کا نقصان بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔

ممکن ہے عام افراد کی برائیاں صرف انہیں یا ان کے ارد گرد موجود چند لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوں اگر کوئی بڑا آدمی کسی برائی کا ارتکاب کرے تو اس کے برے اثرات اطراف میں پھیل کر پورے ماحول کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اگر معاشرے میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز شخص نیک ہوتا ہے تو اس کے نیک اعمال کے اثرات اور خوشبو بھی پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر ماحول کو معطر کر دیتی ہے۔ معاویہ کے بعد یزید جیسے شخص کا مسلمانوں کا خلیفہ بن جانے اور اپنے آپ کو جانشین پیغمبر کہلوانے سے بڑھ کر بھی کوئی انحراف ہو سکتا ہے؟!

اب[1] اس حکم الٰہی پر عمل درآمد کرنے کے لئے راستہ بھی ہموار ہے۔ راستہ ہموار ہے؟یعنی کیا مطلب؟ کیا کوئی خطرہ نہیں ہے؟ کیوں نہیں۔ خطرات تو موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اقتدار پر قابض شخص اپنے مقابلے میں آنے والوں کے لئے خطرناک ثابت نہ ہو؟ یہ تو ایک قسم کی جنگ ہے۔ کیونکہ آپ اسے تخت اقتدار سے نیچے اتارنا چاہتے ہیں تو کیا وہ بیٹھ کر تماشا دیکھے گا؟ ظاہر ہے وہ بھی آپ کو نقصان پہچانا چاہے گا تو بس پھر خطرہ تو موجود ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہے کہ راستہ ہموار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا ماحول اور اس کے حالات ایسے ہیں کہ ممکن ہے کہ امام حسینؑ کی آواز اس زمانے میں اور پوری تاریخ کے انسانوں کے کانوں تک پہنچ جائے۔ اگر امام حسینؑ معاویہ کے دور میں قیام فرماتے تو آپؑ کا پیغام دفن ہو چکا ہوتا کیونکہ معاویہ کے دور حکومت میں حالات اور سیاست ہی کچھ ایسی تھی کہ لوگ حق بات سن ہی نہیں سکتے تھے لہٰذا امام عالی مقامؑ نے معاویہ کے دور حکومت میں دس سال تک منصب امامت پر فائض رہنے کے باوجود کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اس دور میں کوئی ایسا عمل انجام دیا اور نا ہی کوئی اقدام یا قیام کیا کیونکہ اس دور میں راستہ ہموار نہیں تھا۔ امام حسینؑ سے پہلے امام حسنؑ وقت کے امام تھے تو آپؑ نے بھی قیام نہیں کیا تھا کیونکہ ان کے دور میں بھی حالات سازگار نہیں تھے۔ نہ یہ کہ امام حسنؑ اس کام کے لئے لائق نہیں تھے۔ بلکہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ اور امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ اور دیگر آئمہ طاہرینؑ کی سیرت اور کردار میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں البتہ امام عالی مقامؑ نے یہ

---

[1] یعنی معاویہ کی موت اور یزید کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد

عظیم الشان قربانی دے کر تمام آئمہ اطہارؑ پر (جنہوں نے یہ عمل انجام نہیں دیا ہے) سبقت حاصل کی ہے لیکن منصب امامت کے لحاظ سے تمام آئمہ طاہرینؑ برابر ہے۔

امام حسینؑ کو ان انحرافات کا سامنا کرنا پڑا ہے تو پس انہیں اپنی ذمہ داریوں پر عمل کرنا بھی ہو گا کیونکہ موقعہ بھی مناسب ہے لہٰذا اب کسی عذر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اس لئے عبد اللہ ابن جعفر، محمد بن حنفیہ اور عبد اللہ ابن عباس وغیرہ (یہ کوئی عام لوگ نہیں تھے بلکہ دین شناس ،عارف، عالم اور فہم وادراک رکھنے والے لوگ تھے) امامؑ سے کہتے تھے مولا! خطرہ ہے آپ نہ جایئے۔ یعنی وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جب ذمہ داریوں کے انجام دہی میں خطرات موجود ہوں تو ذمہ داریاں ساقط ہو جاتی ہیں۔ ان لوگوں میں اس بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی تھی کہ یہ کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ہے جو خطرات کہ موجودگی سے ساقط ہو جائے۔ کیونکہ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں ہمیشہ خطرات ہوتے ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بظاہر اس قسم کی ایک بڑی مقتدر اور انتہائی مضبوط حکومت کے خلاف کام کرے اور اسے کسی بھی قسم کے خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں ہمیشہ خطرات موجود ہوتے ہیں۔ امام حسینؑ کے زمانے میں جو کام انجام پایا اس کی ایک چھوٹی سی جھلک امام خمینی کے دور میں سامنے آئی۔ فرق یہ ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کا نتیجہ شہادت کی صورت میں سامنے آیا جبکہ امام خمینی کے قیام کا نتیجہ حکومت کی صورت میں سامنے آیا۔ امام حسینؑ اور امام خمینی کا ہدف اور مقصد ایک ہی تھا۔ یہی مطلب امام حسینؑ کی تعلیمات کی بنیاد ہے، مذہب شیعہ کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ حسینی تعلیمات پر مشتمل ہے، امام حسینؑ کے تعلیمات کا تعلق اسلام کی مضبوط بنیادوں سے ہے۔

پس ہدف اور مقصد یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے کو اس کے صحیح راستہ کی طرف لوٹانا چاہیے۔ مگر کب؟ اس وقت جب اسلام کو اس کے راستے سے ہٹا دیا گیا ہو، بعض لوگوں کی جہالت، ظلم و استبداد اور خیانت نے مسلمانوں میں انحراف پیدا کر دیا ہو اور اس انحراف نے قیام کے لئے ساز گار ماحول فراہم کر دیا ہو۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف زمانے آتے رہتے ہیں کبھی شرائط پوری ہوتی ہیں اور کبھی نہیں ہوتیں امام حسینؑ کے دور میں شرائط پوری تھیں اور اسی طرح ہمارے زمانے بھی لہٰذا امام خمینی نے بھی وہی کام کیا کیونکہ ہدف ایک تھا۔ البتہ جب انسان اس مقصد کے حصول کے لئے قدم اٹھاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک ظالم اور جابر حکومت کے خلاف قیام کرے اور اسلام، اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کو اس کے صحیح راستے پر گامزن کر دے تو اس قیام کے دوران کبھی اسے حکومت مل جاتی ہے اور کبھی حکومت نہیں ملتی اور درجہ شہادت پر فائز ہو جاتا ہے۔ تو کیا اس صورت میں ذمہ داری کی ادائیگی واجب نہیں ہے؟ کیوں نہیں، واجب ہے اگر چہ وہ درجہ شہادت پر فائز ہو جائے۔ کیا اس صورت میں جب وہ اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے شہادت پر فائز ہو جائے تو اس قیام کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟ کیوں نہیں؟ فائدہ ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس قیام اور تحریک کے دوران وہ درجہ شہادت پر فائز ہو جائے یا اسے حکومت مل جائے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دونوں کے فائدے الگ ہیں، لہٰذا ہر حال میں قیام کرنا اور تحریک چلانا ضروری ہے۔ یہ وہ کام تھا جسے امام حسینؑ نے انجام دیا اور آپؑ ہی وہ شخصیت تھے کہ جس نے پہلی بار قدم اٹھایا آپؑ سے پہلے کسی نے یہ کام انجام نہیں دیا تھا کیونکہ رسالت مآب اور امیر المومنینؑ کے دور میں ایسا کوئی انحراف وجود میں نہیں آیا تھا اگر بعض موارد میں انحرافات تھے تو بھی ان کے خلاف قیام کی شرائط پوری نہیں تھیں اور نہ ہی حالات مناسب تھے۔ لیکن امام

حسینؑ کے دور میں دونوں چیزیں (یعنی انحرافات اور شرائط) موجود تھیں۔ تحریک حسینی کی اصل حقیقت بھی یہی ہے۔

پس بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہے کہ امام حسینؑ نے اس لئے قیام کیا کہ اس عظیم واجب کو، جو اسلامی نظام اور اسلامی معاشرے کی از سرنو تعمیر یا اسلامی معاشرے میں جنم لینے والے انحرافات سے مقابلہ کرنے سے عبارت ہے ،انجام دے سکیں اور یہ کام قیام اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے ممکن تھا بلکہ یہ خود ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک بہت بڑا مصداق ہے۔ البتہ اس کام کا نتیجہ کبھی حکومت کی صورت میں نکلتا ہے، امام حسینؑ اس کے لیے تیار تھے اور کبھی اس کا نتیجہ شہادت کی صورت میں نکلتا ہے اور امام حسینؑ اس کے لیے بھی مکمل طور پر تیار تھے۔ ہم کس دلیل کی بنا پر یہ بات کہہ رہے ہیں؟ ان باتوں کو ہم نے خود امام حسینؑ کے فرامین سے اخذ کیا ہے ہم نے امامؑ کے فرامین میں سے چند ایک جملوں کا انتخاب کیا ہے گو کہ اس سلسلہ میں امامؑ کے فرامین کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مدینہ میں اس رات جب مدینہ کے حاکم ولید نے آپؑ کو بلایا اور کہا کہ معاویہ مر گیا ہے لہٰذا آپؑ کو یزید کی بیعت کرنی ہو گی۔ امام حسینؑ نے اس کے جواب میں فرمایا: صبح تک صبر کرو "اننظر و تنظرون الینا احق بالبیعت و الخلافۃ" ہم بھی دیکھتے ہیں اور تم بھی دیکھو کہ ہم میں سے بیعت اور خلافت کا حقدار کون ہے؟ دوسرے دن جب راستے میں امام عالی مقامؑ سے ملاقات ہوئی تو اس نے آپؑ سے کہا: اے اباعبداللہؑ! آپ خود کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہے ہیں۔ خلیفہ کی بیعت کیوں نہیں کرتے؟ آیئے خلیفہ کی بیعت کریں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالیں، خود کو مشکلات میں نہ ڈالیں۔ تو آپؑ نے اس کے جواب میں یہ جملہ فرمایا: انا

للہ وانا الیہ راجعون وعلی الاسلام السلام ، اذقد بلیت الامۃ براع مثل یزید[1] اناللہ وانا الیہ راجعون، جب یزید جیسا شخص امت مسلمہ کا خلیفہ بن جائے تو اسلام کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے۔

یعنی جب یزید جیسا شخص حاکم بن جائے اور اسلام یزیدیت جیسے مرض میں مبتلا ہو جائے تو پھر تو اسلام کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس کی فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔ یہاں صرف یزید کی ذات کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ جو بھی یزید جیسا ہو۔ یعنی امامؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب تک جو بھی ہوا وہ قابل برداشت تھا لیکن اب چونکہ اصول دین اور اسلامی نظام خطرے میں ہے اور یزید جیسے شخص کی حکومت سے اسلام مٹ جائے گا۔ اسی وجہ سے انحراف کا خطرہ بہت بڑا اور سنگین مسئلہ ہے کیونکہ خود اسلام کو خطرات لاحق ہیں۔ حضرت اباعبداللہ الحسینؑ نے مدینہ سے روانگی اور اسی طرح مکہ سے روانگی کے وقت محمد بن حنفیہ کے ساتھ متعدد بار گفتگو کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ وصیت مکہ سے روانگی کے وقت کی ہے چونکہ ذی الحجہ میں محمد بن حنفیہ بھی مکہ میں موجود تھے اور انہوں نے کئی مرتبہ امام حسینؑ سے گفتگو کی ہے اور آپؑ نے اپنے بھائی کو ایک وصیت بھی لکھ کر دی۔ جس میں اللہ تعالی کی وحدانیت کی گواہی نیز دیگر امور کو بیان کرنے کے بعد لکھا: إِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَلاَبَطِراً وَلاَمُفْسِداً وَلاَظَالِماً۔ یعنی آپ فرماتے ہے کہ لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اور دشمن کی پروپیگنڈا مشینری انہیں دھوکا نہ دے کہ امام حسینؑ بھی دوسروں کی مانند ہیں اور مختلف جگہوں پر خروج کرتے ہیں صرف اس لئے تا کہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیں، خود نمائی، عیاشی اور ظلم و فساد برپا کرنے کے لیے میدان جنگ میں قدم رکھتے ہیں۔ آپ فرماتے

[1] بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۲۵،۳۲۶

ہے کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے بلکہ میں صرف اپنے جد بزرگوار حضرت محمد ﷺ کی امت کی اصلاح کے لیے میدان میں آیا ہو۔ میں فقط اصلاح کرنا چاہتا ہوں "یہ وہ واجب تھا کہ جسے امام حسنؑ نے بھی انجام نہیں دیا ہے۔

یہ اصلاح "خروج" کے ذریعے ممکن ہے، خروج یعنی قیام اور امام حسینؑ نے اس وصیت نامے میں اس بات کی نشاندہی کی ہے اور تقریباً واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ سب سے پہلے ہم قیام کرنا چاہتے ہیں اور ہمارا یہ قیام بھی اصلاح کے خاطر ہے نہ اس لئے کہ حکومت اور اقتدار ہمارے ہاتھ آجائے اور نہ ہی اس لیے کہ ہم جا کر صرف شہید ہونا چاہتے ہیں، ہر گز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہم تو صرف اصلاح چاہتے ہیں۔ البتہ یہ جو اصلاح کا کام ہے یہ کوئی چھوٹا اور معمولی کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی تحریکوں کے دوران کبھی حالات اور شرائط ایسے پیش آ جاتے ہیں انسان حکومت تک پہنچتا ہے اور زمام اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے اور کبھی وہ یہ کام نہیں کر سکتا، یعنی یہ ناممکن ہو جاتا ہے بلکہ وہ خود ہی شہید ہو جاتا ہے۔ جبکہ دونوں صورتوں میں اس کا قیام اصلاح کے لئے ہوتا ہے اسی لئے امام فرماتے ہیں: ارید ان امر بالمعروف وانھی عن المنکر و اسیر بسیرۃ جدی[1]۔ اصلاح کا ایک مصداق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

امام حسینؑ نے مکہ سے دو گروہوں کے نام خطوط لکھے ہیں ایک خط بصرہ کے قبیلوں کے سرداروں کے نام اور دوسرا خط کوفہ کے قبیلوں کے سرداروں کے نام لکھا۔ بصرہ کے قبیلوں

---

[1] میں خود نمائی، عیاشی اور ظلم وفساد برپا کرنے کے لئے خروج نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں تو صرف اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لئے خروج کر رہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف کروں اور نہی عن المنکر انجام دوں میں اپنے نانا اور بابا کی سیرت کے مطابق قدم اٹھانا چاہتا ہوں۔ بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۲۹

کے سرداروں کے نام خط میں آپ تحریر فرماتے ہیں: وقد بعثت رسولی الیکم بھذا الکتاب، وانی ادعو کم الی کتاب اللہ والی نبیہ، فان السنۃ قد امیتت وان البدعۃ قد احییت فان تجیبوا دعوتی وتطیعوا امری اھدکم سبیل الرشاد[1] میرا نمائندہ میرے خط لے کر تمہارے پاس آیا ہے اور میں تم لوگوں کو کتاب خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ بے شک سنت رسولؐ کو زندہ در گور کر دیا گیا ہے اور زمانہ جاہلیت کی بدعتوں کو زندہ کر دیا گیا ہے، اگر تم میری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے میری پیروی کرو تو میں تم کو راہ راست کی ہدایت کروں گا۔ یعنی میں اپنی اس عظیم ذمہ داری پر عمل کرتے ہوئے اسلام، سنت رسول اکرم اور اسلامی نظام کو زندہ کرنا چاہتا ہوں بدعتوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں اور رسول اکرم ﷺ کی سنت کا احیاء کرنا چاہتا ہوں۔ اسکے بعد کوفہ کے سرداروں کے اپنے خط میں لکھا: فلعمری ما الامام الا الحاکم بالکتاب القائم بالقسط الدائن بدین الحق والحابس نفسہ علی ذالک للہ[2] امام صرف وہی ہے جو کتاب الٰہی کے مطابق حکومت کرے، عدل وانصاف کو قائم کرے، ملک، معاشرے اور قانون کی حق کی طرف رہنمائی کرے اور خود صراط مستقیم اور راہ خدا پر گامزن رہ کر اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ اسلامی معاشرے کا امام اور پیشوا ایسا شخص نہیں بن سکتا، جو فاسق وفاجر ہو، خیانت کار ہو، فسادی ہو اور برے اور قبیح اعمال کو انجام دینے والا ہو بلکہ اسلامی معاشرے کا حاکم، امام اور پیشوا اس کو ہونا چاہیے جو کتاب خدا پر عمل کرنے والا ہو۔ اور معاشرے میں

---

[1] بحارالانوار، ج ۴۴، ص ۳۴۰

[2] بحارالانوار، ج ۴۴، ص ۳۳۴

لوگوں کے سامنے کتاب خدا کے احکام پر عمل کرے نہ کہ کسی بند کمرے میں دو رکعت نماز پڑھنے والا ہو۔

اسلامی معاشرے کے حاکم کو چاہیے کہ کتاب خدا کے احکامات کو معاشرے پر لاگو کرے، عدل اور سماجی انصاف کے نظام کو نافذ کرے اور حق کو معاشرے کا قانون قرار دے۔ الدائن الحق۔ یعنی حق کو معاشرے کا آئین اور قانون قرار دیتے ہوئے باطل کو نکال پھینک دے۔ الحابس نفسہ علیٰ ذالک للہ۔ اس جملے کا ظاہری معنی یہ ہے کہ خدا کے راستے میں جس طرح بھی ہو اپنی حفاظت کرے اور شیطانی اور مادّی جلووں اور رنگینیوں کا اسیر نہ ہو۔

پس امام حسینؑ کے اس خط سے بھی آپؑ کے مقصد اور ہدف کا پتہ چلتا ہے۔ امام حسینؑ نے مکہ سے روانگی کے بعد راستے میں مختلف مقامات پر مختلف انداز سے گفتگو فرمائی ہے۔ جب آپؑ کا قافلہ "بیضہ" نامی مقام پر پہنچا تو حر ابن یزید ریاحی بھی آپ کے ساتھ چل رہا تھا۔ آپؑ نے تھوڑی دیر آرام فرمانے سے پہلے یا آرام کے بعد کھڑے ہو کر دشمن کے لشکر خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ایھا الناس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رای سلطانا جائرا مستحلا لحرم اللہ ناکثا لعھد اللہ، ومخالفا لسنۃ رسول اللہ یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان ثم لم یغیر بقول ولا فعل کان حقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ۔۔۔ اے لوگو! رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "جو شخص کسی جابر اور ظالم حاکم کو دیکھے جو حرام خدا کو حلال جانتا ہو، قانون خدا کو توڑنے والا، سنت رسول کا مخالف اور مخلوق خدا میں گناہ و سرکشی سے حکومت کرنے والا ہو تو پھر وہ اپنے قول و فعل سے اس کے خلاف حکمت عملی اختیار نہ کرے تو خداوند عالم اس سکوت و جمود اور خاموشی اختیار کرنے والے شخص کا ٹھکانہ اس ظالم سلطان کے ساتھ کر دے گا۔ یعنی اگر کوئی یہ دیکھے کہ معاشرے میں کوئی حاکم برسر حکومت ہے اور ظلم و ستم کر رہا ہے، حرام خدا کو حلال

قرار دے رہا اور حلال خدا کو حرام بنا رہا ہے اور اس نے حکم الٰہی کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور دوسرے افراد کو بھی عمل[1] نہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے، لوگوں میں گناہ اور علم دشمنی کو فروغ دے رہا ہے۔ اس زمانے میں ظالم اور جابر حاکم کا کامل مصداق یزید تھا۔ لم یغیر بقول ولا فعل ۔ اپنی زبان و عمل سے اس کے خلاف اقدام نہ کرے تو۔ کان حقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ[2] تو اللہ تعالی کا حق ہے کہ وہ قیامت کے دن سکوت و جمود اختیار کرنے والے اس بے عمل شخص کو اسی ظالم کے ساتھ یک ہی جگہ رکھے"۔ پس پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلے سے بیان کر دیا تھا کی اگر اسلامی نظام انحراف کا شکار ہو جائے تو کیا کام کرنا چاہیے، امام حسینؑ نے پیغمبر اکرم ﷺ کے اسی قول کو اپنی تحریک کی بنیاد قرار دیا۔

پس تو پھر ان حالات میں کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ لم یغیر بقول ولا فعل۔ یعنی اپنی زبان و عمل سے اقدام کرے"۔ اگر انسان ایسے حالات کا مشاہدہ کرے تو شرائط و حالات کو دیکھ کر اقدام کرے، اس پر واجب ہے کہ ظالم و جابر حاکم کے عمل کے جواب میں قیام کرے۔ وہ اس قیام و اقدام میں جس قسم کے حالات سے دوچار ہو، قتل ہو جائے، زندہ رہے یا ظاہراً اسے کامیابی ملے، یا نہ ملے، ان تمام حالات میں قیام اس کی ذمہ داری ہے۔ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان حالات میں قیام کرے اور یہ وہ ذمہ داری ہے جسے حضرت ختمی مرتبت ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

---

[1] شریعت الٰہی کے مطابق عمل کرنے سے روکے ہوئے ہے۔

[2] بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۸۲

اس کے بعد امام حسینؑ نے فرمایا: وانی احق بھذا،"[1]، میں اس قیام کا باقی تمام مسلمانوں سے زیادہ سزاوار ہو کیونکہ میں فرزند پیغمبر ﷺ ہوں۔ اگر پیغمبر اکرم ﷺ نے حالات کی تبدیلی یعنی اس قیام کو ایک ایک مسلمان پر واجب کیا ہے تو ظاہر ہے کہ حسین ابن علیؑ جو فرزند رسول خدا ﷺ اور آپؐ کے علم و حکمت کے وارث بھی ہیں، اس قیام کے لئے دوسروں سے زیادہ مناسب ہیں۔ پس امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی لیے قیام کیا ہے اور وہ اپنے قیام کے علل و اسباب کو بیان فرمارہے ہیں۔ "عذیب" نامی مقام پر جب چار افراد آپؐ سے آ ملے تو آپؐ نے فرمایا:

اما واللہ انی لارجو ان یکون ما اراد اللہ بنا قتلنا او ظفرنا[2]۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کامیابی ہمارے قدم چومے یا ہم راہ خدا میں قتل کر دیے جائیں، ذمہ داری کو ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔ آپؑ نے یہی فرمایا کہ خداوند عالم نے جس چیز کو ہمارے لئے مقرر فرمایا ہے، اس میں ہماری بہتری اور بھلائی ہے۔ ہم اپنی ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں خواہ اس راہ میں قتل کر دیئے جائیں یا کامیاب ہو جائیں۔ سرزمین کربلا میں قدم رکھنے کے بعد آپ نے اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا:

الاترون الی الحق لایعمل بہ والی الباطل لایتناھی عنہ لیرغب المومن فی لقاء ربہ حقا حقا[3]

---

[1] بحارالانوار، ج ۴۴، ص ۳۸۲

[2] خدا کی قسم! جو کچھ اللہ نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے وہ ہمارے لیے صرف خیر و برکت ہی ہے، خواہ قتل کر دیے جائیں یا کامیاب ہو جائیں۔ اعیان الشیعہ، ج ۱، ص ۵۹۷

[3] کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں کیا جارہا ہے اور باطل سے دوری اختیار نہیں کی جارہی ایسے وقت میں مومن کو چاہیے کہ وہ اللہ سے ملاقات کے لئے تیار رہے۔ بحارالانوار، ج ۴۴، ص ۳۸۱

پس امام حسینؑ نے ایک ایسے واجب کو ادا کرنے کیلئے قیام فرمایا جو ہر زمانے اور ہر تاریخ میں تمام مسلمانوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے اور یہ واجب عبارت ہے کہ اس بات سے کہ مسلمان جب اس بات کا مشاہدہ کریں کہ اسلامی معاشرے کا نظام بنیادی خرابی کا شکار ہو گیا ہے اور اس سے تمام اسلامی احکامات کو خطرہ لاحق ہے تو ایسے حالات میں ہر مسلمان پر قیام کرنا واجب ہے۔

یہ قیام مناسب حالات اور شرائط میں واجب ہوتا ہے یعنی قیام کرنے والا یہ جانتا ہو کہ قیام اثر بخش ہو گا اس کے علاوہ قیام کرنے والے کے زندہ رہنا، قتل نہ ہونا، یا مشکلات و مصائب کا سامنا نہ کرنا یہ شرائط میں سے نہیں ہیں۔ لہٰذا امام حسینؑ نے قیام کیا اور عملی طور پر اس واجب کو انجام دیا تاکہ رہتی دنیا کیلیے ایک درس ہو۔ امام حسینؑ نے ایک ایسا کام کر دکھایا کہ جس سے لوگوں کے ضمیر جاگ گئے۔ لہٰذا آپ نے دیکھا کہ امامؑ کی شہادت کے بعد یکے بعد دیگر کئی اسلامی تحریکیں وجود میں آ گئیں، لیکن ان تحریکوں کو کچل دیا گیا۔ دشمن کی طرف سے کسی تحریک کو کچل دیا جانا کوئی اہم بات نہیں ہے یہ تلخ ضرور ہے لیکن اس سے بھی زیادہ تلخ بات یہ ہے کہ کوئی معاشرہ اس منزل پر پہنچ جائے کہ وہ اپنے دشمن کے مقابلے میں کسی بھی قسم کا رد عمل ظاہر کرنے کی صلاحیت ہی کھو دے اور یہ بات ایک معاشرے کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔

حسین ابن علیؑ نے ایک ایسا کام انجام دیا جو آج بھی زندہ و پائندہ ہے جس کے نتیجے میں طاغوتی حکومتوں کے دور میں بھی کچھ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے کہ جو صدر اسلام سے زمانوں کا فاصلہ رکھنے کے باوجود ظلم و جبر سے مقابلے کے لیے امام حسن کے زمانے کے لوگوں سے زیادہ باعزم تھے۔ البتہ ان تمام تحریکوں کا کچل دیا گیا۔ آپ اہل مدینہ کے قیام پر غور کیجیے جو "واقعہ حرہ" کے نام سے مشہور ہے اور بعد میں توابین اور مختار کے قیام تک اور اس کے بعد بنو امیہ

اور بنو عباس کے ادوار تک مختلف قوموں کے درمیان جو مختلف تحریکیں وجود میں آتی رہیں ان تمام تحریکوں کا بانی کون تھا؟ حسین ابن علیؑ۔ اگر امام حسینؑ قیام نہ فرماتے تو کیا معاشرے سے سستی کاہلی اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی عادت ، ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی عادت میں تبدیل ہو سکتی تھی۔؟

ہم یہ کیوں کہتے ہے اس معاشرے میں ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی حس مر چکی تھی؟ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب امام حسینؑ مدینہ منورہ سے، جو اسلام کی عظیم اور بزرگ ہستیوں کا مرکز تھا، مکہ شریف لے گئے تو اس وقت ابن عباس، ابن زبیر، ابن عمر اور اوائل کے خلفاء کے بیٹے سب مدینہ میں موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی اس خونی اور تاریخی قیام میں امام حسینؑ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ پس قیام امام حسینؑ کے آغاز سے پہلے خواص (اس سلسلے میں) کوئی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن امام حسینؑ کے قیام کے بعد ظلم سے نفرت کی روح زندہ ہو گئی۔ یہ وہ عظیم درس ہے جسے واقعہ کربلا کے دروس کے ساتھ ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ "الموعود لشهادته قبل استهلاله و ولادته" یا امام حسینؑ کی ولادت باسعادت سے قبل "بكته السماء ومن فيها والارض ومن عليها[1]" کہا گیا ہے۔ لوگوں کو امام حسینؑ کے اس عظیم غم اور عزاء اور اس کے خاص احترام کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور ان دعاوں اور زیارات کی تعبیرات میں ان پر گریہ کیا گیا ہے تو ان سب کی وجہ یہی ہے۔

---

[1] وہ شخص جس کی ولادت سے پہلے اس کی شہادت کی نوید سنائی گئی، جس پر آسمان اور اس میں موجود لوگوں اور زمین اور اس پر موجود تمام چیزوں نے گریہ کیا۔ (بحار الانوار، ج ۴۴، ۳۴۷)

لہٰذا آج جب آپ اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کو امام حسینؑ ہی نے زندہ کیا اور آپؑ ہی اسلام کے محافظ ہیں۔

ساتواں باب: حضرت ز عَلَیۡہَاالسَّلَام اور دیگر سفیران کربلا کی تحریک

زینب کبر عَلَیۡہَاالسَّلَام)کی تحریک

زینب کبر عَلَیۡہَاالسَّلَام ایک عظیم خاتون ہیں مسلمانوں کی نظر میں اس عظیم خاتون کو جو عظمت حاصل ہے وہ کس وجہ سے ہے؟ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کو یہ عظمت اس لئے حاصل ہے کہ آپ علی ابن ابی طا عَلَیۡہِ السَّلَام کی بیٹی اور حسنینؑ کی بہن ہیں۔ (کیونکہ صرف یہ) نسبتیں ہر گز ایسی عظمت کا سبب نہیں بن سکتیں۔ ہمارے باقی آئمہ طاہرینؑ کی بھی مائیں اور بہنیں تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے۔ زینب ک عَلَیۡہَاالسَّلَام جیسی کون ہے؟

زینب کب عَلَیۡہَاالسَّلَام کی اہمیت، آپؑ کی عظمت، آپؑ کی عظیم اسلامی اور انسانی تحریک اور موقف کی وجہ سے ہے جسے آپؑ نے فریضہ الٰہی کی بنیاد پر انجام دیا تھا۔ آپؑ کا کام، آپ کے فیصلے اور آپؑ کی تحریک کی نوعیت نے آپؑ کو ایسی عظمت عطا کی ہے (پس) جو خاتون بھی ایسا کام کریں گی اگرچہ وہ امیر المومنینؑ کی بیٹی نہ بھی ہو تب بھی ایسی عظمت حاصل کر سکتی ہے۔ اس عظمت کا بہترین حصہ یہ ہے کہ آپؑ نے پہلے مرحلے میں ہی موقع شناسی کا ثبوت دیا، امام حسینؑ کے کربلا جانے سے پہلے کے موقع کو بھی پہچانا اور دوسرے مرحلے میں ہر موقع کی مناسبت سے الگ الگ اقدام کا انتخاب کیا اور انہیں اقدامات نے زینب کب عَلَیۡہَاالسَّلَام کی شخصیت کو عظیم ترین بنا دیا۔

کربلا کی جانب روانگی سے پہلے ابن عباس اور ابن جعفر جیسے بزرگان اور صدر اسلام کی نامور شخصیات جو فقاہت، شہامت، ریاست اور حسب و نسب کی دعویدار تھیں وہ بھی شش و پنج کا شکار ہو گئیں۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ لیکن زینب کبریٰ شش و پنج کا شکار نہیں ہوئیں بلکہ وہ سمجھ گئیں کہ آپ کو کس راستے کا انتخاب کرنا چاہیے اور اپنے امام کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے اور آپؑ امام حسینؑ کے ساتھ چلی گئیں۔ ایسا ہر گز نہیں تھا کہ آپؑ نہ جانتی ہوں کہ یہ راستہ بہت سخت ہے۔ بلکہ آپ دوسروں سے بہتر اس بات کو محسوس کر رہی تھیں۔ آپؑ ایک خاتون تھیں، جو اپنے فریضے کی ادائیگی کے لیے اپنے شوہر اور خاندان سے دور ہو رہی تھیں، اس بنا پر آپ نے چھوٹے بچوں اور نوجوان بیٹوں کو اپنے ساتھ لیا۔ آپؑ محسوس کر رہی تھیں کہ کیسا حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔

ایسے بحرانی حالات میں جب طاقتور ترین مرد حضرات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے ،ن آپؑ اپنا فریضہ سمجھ گئیں اور اپنے امام کی حمایت کرتے ہوئے اپنے آپ کو امام کی شہادت [1] کے لئے تیار کیا۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب دنیا تاریک ہو گئی، دل و جان اور آفاق عالم پر اندھیرا چھا گیا تو یہ عظیم خاتون روشنی بن کر چمکنے لگیں۔ حضرت ز: عَلَیْہَا السَّلَام اس منزل پر فائز ہو گئیں جہاں تک تاریخ بشریت کے صرف بلند ترین افراد یعنی انبیاء پہنچ سکتے ہیں۔

یقیناً اگر حضرت ز: عَلَیْہَا السَّلَام نہ ہوتیں تو واقعہ کربلا باقی نہ رہتا ۔ اور نہ ہی زینب کؑ عَلَیْہَا السَّلَام کے بغیر عاشور کا واقعہ اتنا عام ہوتا اور تاریخ میں زندہِ جاوید بن کر ابھرتا، واقعہ عاشورا کے آغاز

[1] اور اس کے بعد کے واقعات اور سختیوں کے لئے تیار کیا۔

سے آخر تک علیؑ کی بیٹی زینب کی شخصیت اور کردار اتنا نمایاں ہے کہ انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ ایک خاتون کے لباس اور علیؑ کی بیٹی کی صورت میں ایک دوسرا حسینؑ ہے۔

قطع نظر اس کے کہ اگر جناب زینب علیہا السلام نہ ہوتی تو عاشورا کے بعد کیا ہوتا، شاید امام زین العابدینؑ بھی شہید کر دیئے جاتے، شاید امام حسینؑ کا پیغام کہیں بھی نہ پہنچتا۔ امام حسینؑ کی شہادت سے پہلے بھی جناب زینب علیہا السلام آپؑ کے لئے ایک ایسے سچے غمخوار کی مانند تھیں کہ ان کی موجودگی میں امام حسینؑ کبھی بھی تنہائی اور تھکاوٹ کا احساس نہیں کرتے تھے۔ انسان ایسے کردار کو جناب زینبؑ کے کردار اور گفتار میں مشاہدہ کر سکتا ہے۔

دو مرتبہ جناب زینبؑ نے کسی حد تک بے چینی کا احساس کیا اور امام حسینؑ کے پاس جا کر اپنی اس بے چینی کا اظہار بھی کیا۔ ایک مرتبہ مکہ سے کربلا جاتے ہوئے کسی ایک منزل میں جب حضرت مسلم بن عقیل علیہما السلام کی شہادت سے متعلق مختلف خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ حضرت زینب علیہا السلام بھی آخر ایک عورت تھیں وہ زنانہ جذبات رکھتی تھیں اور لطیف زنانہ احساس رکھتی تھیں۔ بلکہ جذبات اور احساسات کا اصلی مظہر ہی خاندان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ تمام تر طاقت، شجاعت اور مصائب و مشکلات کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے باوجود انسانی نفسیات، پاکیزگی اور انسانی ترحم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بھی تو یہی خاندان ہے۔ ہم امام حسینؑ کی مثال پیش کرتے ہیں وہ حسینؑ جو پوری دنیا کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں یا ایک صحرا میں بھرے بھیڑیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے سے نہیں گھبراتے لیکن وہی شخص کبھی بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں کے مقابلے میں منقلب ہو جاتا ہے مثلاً اس وقت جب ایک حبشی غلام زخمی ہو کر زمین پر گر گیا، شاید وہ ابو ذر غفاری کا غلام "جون" تھا جو امام کے چاہنے والوں اور آپ کے ارادتمندوں میں سے تھا۔ اجتماعی اور معاشرتی حوالے سے اس دور کے مسلمانوں میں غلام کوئی

خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اور نہ ہی خاندانی لحاظ سے کسی اعلٰی خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ عاشور کے دن کربلا کے میدان میں امام حسینؑ کی رکاب میں بڑے بڑے لوگوں نے اپنی جان کے نذرانے پیش کئے جیسے حبیب ابن مظاہر، زہیر ابن قین اور دیگر شہدائے کربلا کہ جن کا شمار کوفہ کے بزرگوں میں ہوتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کی شہادت پر بھی امام حسینؑ نے ایسا ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا جو ردعمل اس حبشی غلام کی شہادت پر دکھایا۔ جب مسلم بن عوسجہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے تو آپ نے مسلم بن عوسجہ سے مخاطب ہو کر کہا: انشا اللہ تعالی سے اس کا اجر پاؤگے"۔ لیکن یہ حبشی غلام گرتا ہے کہ جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کا رشتہ دار اور رونے والا ہے۔ امام حسین آگے بڑھے اور اس غلام کے ساتھ وہی کچھ کیا جو آپ نے حضرت علی اکبر کے ساتھ کیا تھا۔ یعنی امام حسینؑ اس غلام کے سرہانے زمین پر بیٹھ گئے اور اس کے خون آلودہ سر کو اپنے زانو پر رکھا لیکن امامؑ کے دل کو اب بھی سکون نہیں ملا، اور سب نے یہ منظر دیکھا کہ ایک مرتبہ امام عالی مقام نے اپنے چہرہ مبارک کو "جون" کے خون آلودہ چہرے پر رکھا۔ یوں انسانی ہمدردی اور احساس کا ایک عجیب منظر سامنے آگیا!۔ لہٰذا حضرت زینبؑ ایک عورت کی حیثیت سے لطیف و زنانہ احساسات رکھتی ہیں۔ نہ ایک عام عورت کی حیثیت سے بلکہ امام حسینؑ کی بہن اور ایک ایسی بہن جو اپنے دل و جان سے اپنے بھائی کو چاہتی ہے، ایک ایسی بہن جو اپنے شوہر اور گھر بار کو چھوڑ کر امام حسین کے ساتھ آگئی ہے اور وہ بھی تنہا نہیں آئی ہے بلکہ اپنے ساتھ اپنے دونوں بیٹوں عون و محمد کو بھی لے آئی ہے، تاکہ وہ ان کے ساتھ رہے اور جب اللہ تعالی کی راہ میں قربانی کی ضرورت پڑے تو انہیں قربان کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود جناب ز؛ عَلَيۡهَا السَّلَام نے جب خطرے کا احساس کیا تو امام حسینؑ کے پاس جا کر عرض کی بھائی جان! مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے، حالات خطرناک لگ رہے ہیں۔ اگرچہ آپ جانتی تھیں

کہ جانوں کے نذرانے پیش کرنے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی ہیں لیکن اس کے باوجود اس حد تک حالات کے دباؤ میں آ جاتی ہیں کہ امام حسینؑ سے رجوع کرتی ہیں۔ اس موقع پر امام حسینؑ آپ سے کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کرتے بلکہ امامؑ فرماتے ہے کہ کوئی بات نہیں، اللہ جو چاہے وہ ہی ہو گا یعنی آپ نے تقریباً اسی قسم کا ایک جملہ کہا: مَاشـاء اللّٰہُ کَانَ[1] جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا"۔ اس کے بعد تاریخ میں ہمیں کچھ نہیں ملتا ہے کہ حضرت زینبؑ نے امام حسین سے حالات کے متعلق کچھ کہا ہو یا کوئی سوال کیا ہو یا اپنے چہرے سے کسی پریشانی کا اظہار کیا ہو۔ سوائے شب عاشورا کے۔ نو محرم کے ابتدائی حصہ کے بارے میں بھی ہم کہہ سکتے ہے کہ اس موقع پر بھی جناب زینب کبریٰ عَلَیۡہَاالسَّلَام بے چین ہوئی، اس واقع کے راوی امام زین العابدینؑ ہیں جو اس وقت بیمار تھے۔ آپؑ فرماتے ہیں: میں اپنے خیمے میں لیٹا ہوا تھا اور پھوپھی زینبؑ میری تیمار داری میں مشغول تھیں۔ ہمارے ساتھ والے خیمے میں میرے بابا امام حسینؑ تشریف فرما تھے۔ آپؑ کے خیمے میں جناب ابو ذر کے غلام "جون" آپ کی تلوار کو صیقل کر رہے تھے ،۔ گویا امامؑ کل کی جنگ کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ امام زین العابدین عَلَیۡہِ السَّلَام فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ امام حسینؑ نے زیر لب کچھ اشعار پڑھنا شروع کیے اور ایک شعر پڑھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ: دنیا نے اپنا رخ موڑ لیا ہے اور زندگی انسان سے وفا نہیں کرتی اور موت نزدیک ہے:

یَادَھرُ اُفٌّ لکَ مِن خَلیلِ   کم لکَ بِالاِشرَاقِ وَالاصِیلِ[2]

---

[1] الکافی، ج۶، ص ۵۳۰

[2] اے زمانے! تف ہو تیری دوستی پر! تو اپنے بہت سے دوستوں کو صبح و شام موت کے سپرد کر دیتا ہے (بحارالانوار، ج۴۴، ص۳۱۶)

یہ اس بات کی علامت ہے کہ جو شخص یہ شعر پڑھ رہا ہے اسے یقین ہے کہ وہ بہت ہی جلد اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ امام سجادؑ فرماتے ہیں جب میں نے یہ شعر سنا تو اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھ گیا ۔یعنی میں جان گیا کہ امام حسینؑ اپنی شہادت کہ خبر دے رہے ہیں ۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا مگر پھوپھی زینبؑ یہ سن کے پریشان ہو گئیں۔ اور اٹھ کر بھائی کے خیمے میں چلی گئیں اور امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں : بھائی جان! میں سن رہی ہوں کہ آپ اپنی شہادت کی خبر دے رہے ہیں۔ جب بابا شہید ہوئے تو میں نے کہا ہمارے بھائی موجود ہیں اور جب بھائی حسنؑ شہید ہوئے تو ہم نے کہا: ہمارے بھائی حسینؑ موجود ہیں اور کئی سالوں سے آپ ہی کے بھروسہ پر جی رہی ہوں اور آج میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ بھی اپنی شہادت کی خبر دے رہے ہیں۔

پریشان ہونا حضرت زینبؑ کا حق بھی بنتا ہے میں سوچتا ہو کہ اس دن زینب کبریٰؑ کی جو حالت تھی وہ ایک استثنائی حالت ہے کسی بھی عورت یہاں تک کہ خود امام زین العابدینؑ کی حالت کا بھی زینب کبریٰؑ سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت زینبؑ کی حالت انتہائی سخت اور طاقت فر سا تھی(قافلے میں شامل) تمام مرد عاشورا کے دن شہید کر دیئے گئے تھے۔ عصر عاشور ان خیموں میں امام زین العابدینؑ کے علاوہ کوئی مرد باقی نہیں بچا تھا۔ خود امام زین العابدینؑ بھی بیماری کے بستر پر پڑے ہوئے تھے، شاید بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ اب ایسے حالات میں آپ سوچیے کہ اس خیمہ گاہ میں تقریباً ۸۰ عورتیں اور بچے موجود تھے جنہیں چاروں طرف سے دشمن کے ایک جم غفیر نے گھیر رکھا تھا، اس حال میں ان کی کیا حالت ہونی چاہیے۔ ان میں سے کوئی بھوکا ہو اور کوئی پیاسا ہو بلکہ یہ کہا جائے کہ سب کے سب بھوکے اور پیاسے ہوں، اور سب خوفزدہ اور پریشان حال ہوں۔ بہر حال ایک انتہائی تلخ اور وحشتناک صورت حال ہے

جسے صرف ایک ہی شخصیت نے آگے بڑھ کر سنبھالا تھا اور وہ شخصیت حضرت زینب کبریٰؑ کی تھی۔

صرف ایسا نہیں تھا کہ جناب زینبؑ نے اپنے بھائی کو کھو دیا ہو یا اپنے دو بیٹوں یا اپنے دیگر بھائیوں اور عزیز و اقارب، بنو ہاشم کے اٹھارہ نوجوانوں اور اپنے با وفا اصحاب و انصار کو کھو دیا ہو، ان حالات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک اہم حقیقت تھی، اور شاید اس کی اہمیت اس سے کسی بھی لحاظ سے کم بھی نہ تھی وہ یہ کہ اتنے سارے دشمنوں کی موجودگی میں اس منتشر قافلے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر تھی یہاں تک کہ خود امام زین العابدینؑ کی دیکھ بھال بھی آپ ہی کے ذمہ تھی لہٰذا ان چند گھنٹوں کے درمیان یعنی واقعہ عاشور کے بعد سے لیکر یہ طے ہونے تک کہ دشمن اس لٹے ہوئے قافلے کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اس تاریک اور سخت رات کے ان چند گھنٹوں کے دوران اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جناب زینبؑ پر کیا گذری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران حضرت زینبؑ مسلسل مصروف اور بھاگ دوڑ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آپ کبھی ایک بچے کے پاس جاتی ہیں تو کبھی کسی ایسی ماں کے پاس پہنچتی ہے جس کی گود اجڑ گئی ہے اور کبھی ایسی بہن کے پاس پہنچ جاتی ہیں کہ جس کے سر سے بھائی کا سایہ چھینا گیا ہے۔ گویا آپ مسلسل مصروف ہیں ان سب کو جمع کرتی ہیں اور انکی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ زینبؑ کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ آپؑ اپنے اس بھائی کی طرف رخ کرتی ہیں جو آپؑ کی واحد پناہ گاہ تھے۔ روایت میں ہے کہ جناب زینبؑ آتی ہیں اور اپنے بھائی کے پامال شدہ لاشے کے قریب کھڑی ہوتی ہیں اور دل کی گہرائیوں سے ساتھ فریاد کرتے ہوئے کہتی ہیں: صلّی عَلیک مَلائِکَۃُ السّماء۔ اے نانا جان! آپ پر آسمان کے فرشتے

درود سلام بھیجتے ہیں۔ھَذا الحُسَینُ مُرَمّل بِالدّمَاءِ۔ یہ آپ کا پیارا حسینؑ ہے جو خاک وخون میں غلطاں، کربلا کی گرم ریت پر پڑا ہے۔[1]

یہ جو کہا جاتا ہے کہ عاشوراوہ دن ہے جب خون نے تلوار پر فتح حاصل کی"۔یہ ایک حقیقت ہے اور یہ فتح اور کامیابی حضرت زینب عَلَیْہَا السَّلَام کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی ورنہ خون، کربلا میں ختم ہو چکا تھا اور یہ جنگ کربلا کے میدان میں بظاہر حق کی شکست کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن جو چیز اس ظاہری شکست کو ایک دائمی فتح و کامرانی میں تبدیل کرنے کا سبب بنی وہ حضرت زینب کبریٰ ؑ کی ذات بابرکت تھی۔اس واقعے میں حضرت زینب ؑ نے جو کردار ادا کیا وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔اس واقعے نے یہ ثابت کر دیا کہ عورت تاریخ کے حاشیہ میں نہیں بلکہ تاریخ کے اصلی متن کا حصہ ہے۔ قرآن مجید نے بھی متعدد مقامات پر اس نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے، لیکن یہ واقعہ گذشتہ امتوں سے مربوط کسی دور کا واقعہ نہیں ہے بلکہ زندہ اور قابل ادراک واقعہ ہے جہاں انسان یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ حضرت ز عَلَیْہَا السَّلَام ایک حیرت انگیز اور تابناک عظمت کے ساتھ میدان میں اترتی ہیں اور ایک ایسا کارنامہ انجام دیتی ہیں کہ جس کی بنا پر وہ دشمن جو اپنے مخالفین کا قلع قمع کر کے، سر پر فتح کا تاج پہن کر اپنی کامیابی اور فتح کے نقارے بجارہا تھا اسے اپنے ہی شہر، اپنے محل اور اپنے دارالحکومت میں ذلیل ورسوا ہونا پڑا۔ حضرت زینبؑ نے اس کی پریشانی پر ذلت اور رسوائی کا ایک دائمی داغ لگادیا کہ اس کی فتح اور کامیابی شکست میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔یہی حضرت زینبؑ کا کارنامہ ہے۔ آپ نے اپنے اس عمل

---

[1] اللہوف، سید بن طاوس، ص ۱۳۳۔

سے پوری دنیا پر واضح کر دیا کہ خواتین کے حجاب اور پاکدامنی کو مجاہدانہ وقار اور عظیم جہاد میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

زینب کبریٰؑ کے جو خطبات اور فرامین ہم تک پہنچے ہیں ان سے بھی آپ کی تحریک کی عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بازار کوفہ میں آپ کا ناقابل فراموش خطبہ کوئی معمولی خطبہ نہیں ہے۔ یہ کسی عظیم شخصیت کا معمولی اظہار خیال نہیں ہے بلکہ ان سخت اور دشوار حالات میں اس دور کے اسلامی معاشرے کے مسائل کا مکمل تجزیہ و تحلیل ہے جو انتہائی خوبصورت الفاظ، نہایت عمیق و گہرے مفاہیم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ حضرت زینبؑ کی شخصیت کی طاقت تو دیکھیے کہ آپ کی شخصیت کس قدر طاقتور ہے۔ ابھی دو دن پہلے ایک صحراء میں آپ کے بھائی آپؑ کے قائد اور امام، آپ کے عزیز و اقارب، آپؑ کے بیٹوں اور دیگر جوانوں کو نہایت بے رحمی سے شہید کر دیا گیا ہے اور زندہ بچ جانے والے بچوں اور خواتین کی اس چھوٹی سی جماعت کو قیدی بنایا گیا ہے اور انہیں بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کر کے تماشائیوں کے مجمع کے سامنے سے گذارا گیا ہے۔ اس طرح کہ بعض لوگ خوشیاں منا رہے ہیں اور کچھ لوگ آنسو بہا رہے ہیں۔ ایسے دل کو لرزا دینے والے حالات میں اچانک یہ عظمت و وقار کا سورج طلوع ہوتا ہے اور حضرت زینبؑ اسی لب و لہجے میں گفتگو کرتی ہیں جس انداز میں آپ کے والد بزرگوار حضرت علیہ السلام منبر خلافت پر متمکن ہو کر امت مسلمہ سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اسی انداز تخاطب سے، انہیں کلمات سے، اسی فصاحت و بلاغت سے، انہی بلند و بالا مفاہیم و مضامین کے ساتھ کوفے والوں سے یوں مخاطب ہوتی ہیں: یَا اہلَ الکُوفَۃ یَا اہلَ الخَتلِ وَالغَدر۔ اے کوفے والو! اے بے وفا اور غدار لوگو!

یعنی اے دھوکہ بازو اور بے وفالو گو جنھوں نے ہم سے وفاداری کا ڈھونگ رچایا اور شاید خود تمہیں بھی اس بات کا یقین تھا کہ تم دین اسلام اور اہل بیت رسول ﷺ کے سچے پیروکار ہو لیکن میدان امتحان میں تمہارے قدم ڈگمگا گئے اور اس پر آشوب اور فتنے کے دور میں تم نے اس اندھے پن کا مظاہرہ کیا: هَل فِيكُم اِلّا الصّلفُ وَالنطِفُ وَمَلقُ الاِمَاءِ وَغَمزُ الاَعداءِ۔ کیا تمہارے اندر بیہودہ گوئی، خود پسندی، جھوٹی کنیزوں کی سی چاپلوسی اور دشمنوں کی طرح کے کینہ وعداوت کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ تمہارے قول و فعل میں تضاد تھا، تم اس دھوکے میں تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ تم آج بھی صاحب ایمان ہو، ماضی کی طرح انقلابی ہو، امیر المومنین حضرت علیؑ کے پیروکار ہو حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ تم اس آشوب و فتنے کا مقابلہ نہیں کر سکے تم اپنے آپ کو اس سے نجات نہیں دلا سکے: مَثَلُكُم كَمَثَلِ الّتِي نَقَضَت غَزلَهَا مِن بَعدِ قُوّة انكَاثاً[1]۔ تمہاری مثال اس نادان عورت کی سی ہے جس نے اپنے دھاگے کو مضبوط طریقے سے کاتنے کے بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اس عورت کی طرح ہو گئے جو اون کاتتی ہے اسے دھاگے میں تبدیل کرتی ہے پھر ان دھاگوں کو دوبارہ کھولتی ہے اور انہیں ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ تم نے اپنی بے بصیرتی، حالات کی نزاکت کے عدم ادراک اور حق و باطل کے فرق کو نہ پہچاننے کی وجہ سے اپنے ماضی کے کارناموں پر پانی پھیر دیا ہے۔ تم بظاہر تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اپنے انقلابی ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہو لیکن اندر سے بالکل کھوکھلے ہو اور کوئی بھی تیز ہوا کا جھونکا تمہارے پائے ثبات میں لغزش پیدا کر سکتا ہے۔ یہ اس دور کی مشکلات کا مکمل تجزیہ ہے جو جناب زینبؑ نے اپنے خطبے میں بیان فرمایا ہے۔

حضرت ز عَلَیہَا السَّلَام ان دشوار اور کٹھن حالات میں اس زور بیان اور ان الفاظ سے گفتگو کر رہی تھیں اور آپؑ کے سامنے کوئی معمولی سامعین نہیں بیٹھے تھے کہ جو آرام و اطمینان سے آپ کی

گفتگو کو سن رہے ہوں اور حضرت زینبؑ ایک معمولی خطیب کی طرح ان کے سامنے خطبہ دے رہی ہوں، نہیں! بلکہ آپ کے سامنے دشمنوں کا مجمع تھا۔ آپؑ نیزہ بردار دشمنوں کے نرغے میں تھیں۔ ان کے علاوہ اس مجمع میں کچھ دوغلے کردار کے مالک افراد بھی موجود تھے یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے جناب مسلم کو ابن زیاد کو حوالے کیا تھا، جنہوں نے امام حسینؑ کو ہزاروں خط لکھے اور انہیں کوفہ آنے کی دعوت دی تھی اور پھر بے وفائی کا مظاہرہ کیا تھا یہ وہ لوگ تھے کہ جس دن انہیں ابن زیاد کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا اس دن وہ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ بازار کوفہ میں انہی لوگوں کا مجمع تھا، البتہ کچھ ایسے افراد بھی موجود تھے جو مولائے کائنات امیر المومنین حضرت عَلَیہِ السَّلام کی بیٹی کو اسیر دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے۔

حضرت زینبؑ کا سامنا ایسے ناقابل اعتماد اور مختلف الاوصاف افراد سے تھا، اس کے باوجود آپ اس انداز میں گفتگو فرماتی ہیں۔ آپ ایک تاریخ ساز خاتون ہیں یہ کوئی کمزور خاتون نہیں ہیں ایک ایسی خاتون ہیں جس کو کمزور نہیں کہا جاسکتا۔ ایک صاحب ایمان خاتون کا زنانہ جوہر، مشکل حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے، یہ خاتون ایک اعلیٰ مثال اور اعلیٰ نمونہ ہے پوری دنیا کے بڑے بڑے مردوں اور خواتین کے لئے بہترین مثال ہیں ۔ یہ خاتون نبویؐ اور علویؑ انقلاب کو لاحق ہونے والی آفتوں کا تجزیہ و تحلیل کرتی ہیں اور اہل کوفہ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ تم فتنے و آشوب کے دور میں حق کو نہیں پہچان سکے تم اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواسہ رسولؐ کا سر نیزے پر بلند کیا گیا۔ حضرت زینبؑ کی عظمت کو یہاں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اسیری کے دوران امام زین العابدین علیہ السلام کی تحریک

واقعہ عاشورا کے بعد شیعوں اور نظریہ امامت کے پیروکاروں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ بنو امیہ کے وحشی نوکروں نے کربلا، کوفہ اور شام میں خاندان نبوت کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا اس نے پیروان امامت کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ امام حسینؑ کے قریبی دوست اور اصحاب واقعہ کربلا اور اس کے بعد توابین کی تحریک میں شہید ہو چکے تھے۔ جو لوگ بچ گئے تھے ان میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یزید اور مروان جیسے ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے کھڑے ہو کر حق بات کہہ سکیں۔ شیعوں اور مومنین کی ایک مختصر تعداد موجود تو تھی لیکن وہ انتہائی غیر منظم اور منتشر تھے، ان کے درمیان کوئی تنظیم موجود نہیں تھی، سب وحشت زدہ اور بہت سے امامت کے راستے سے ہی منحرف ہو چکے تھے۔ یہ وہ میراث تھی جو شیعوں کی طرف سے امام زین العابدینؑ کے حصے میں آئی تھی۔ گھٹن کا ماحول تھا، افرادی قوت کی انتہائی کمی تھی۔ ایسے حالات میں امام زین العابدینؑ کو حقیقی اسلام اور مکتب محمدیؐ کی حفاظت کیلئے کچھ ایسے مدبرانہ اور انقلابی اقدامات کرنے کی ضرورت تھی کہ جس کے نتیجے میں ان بکھرے ہوئے لوگوں کو دوبارہ ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے انہیں علوی حکومت یعنی حقیقی اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے تیار کر سکیں ایسے حالات میں امام زین العابدینؑ نے چونتیس سال زندگی بسر کی۔

میں یہاں پر امام زین العابدینؑ کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو آپ (قارئین) کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے چوتھے امام زین العابدینؑ کی زندگی کا افتخار آمیز دور آپؑ کی اسیری کا دور ہے۔ البتہ امام زین العابدینؑ دو مرتبہ اسیر ہوئے اور دونوں مرتبہ آپ کو طوق و زنجیر میں جکڑ کر شام لے جایا گیا۔ پہلی مرتبہ کربلا سے اور دوسری مرتبہ عبد الملک بن مروان کے زمانے

میں مدینہ سے گرفتار کیا گیا۔ جب کربلا سے گرفتار کر کے قافلہ حسینیؑ کے دوسرے اسیروں کے ساتھ شام لے جایا گیا تو آپ مجسمہ قرآن اور اسلام تھے۔

جب شہداء کربلا خاک و خون میں غلطاں ہوئے تب امام زین العابدینؑ کی تحریک کا آغاز ہوا۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں، معصوم بچے، بے سہارا عورتیں امامؑ کے ارد گرد جمع ہوئیں۔ اس کاروان میں امام زین العابدینؑ کے علاوہ دوسرا مرد نہیں تھا امامؑ تنہا ہی ان سب کی راہنمائی کر رہے تھے ۔انہیں جمع کرتے تھے یہاں تک کہ شام پہنچنے تک پورے راستے میں ان کی دیکھ بھال کرتے رہے اور ان لوگوں کو جو ایمان کے رشتے میں جڑے ہوئے تھے ایک لمحہ کے لئے ہی شک و تردید میں مبتلا نہ ہونے دیا۔

جب امام زین العابدینؑ کوفے میں داخل ہوئے تو عبید اللہ ابن زیاد جس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ اس خاندان کے تمام مردوں کو قتل کیا جائے، دیکھا کہ اسیروں کے قافلے میں ایک مرد بھی موجود ہے۔ اس نے پوچھا تم کون ہو؟ فرمایا: میں علی ابن حسینؑ ہوں"۔ اس نے امام کو قتل کی دھمکی دی۔ یہ پہلا موقع تھا امام زین العابدینؑ نے امامت اور معنویت کے جوہر دکھاتے ہوئے فرمایا: أَبِالقَتلِ تُهَدِّدُنِي[1] کیا تو ہمیں موت سے ڈراتا ہے؟ جبکہ ہم تو شہادت کو اپنے لئے کرامت اور راہ خدا میں قتل ہونا باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ ہم موت سے نہیں ڈرتے ہیں، امامؑ کے اس سخت موقف کے سامنے عبید اللہ کو خاموش ہونا پڑا۔

شام میں جہاں امام زین العابدینؑ کو کئی دنوں تک مسلسل اسیروں کے ساتھ قید رکھ کر آپؑ کے ساتھ انتہائی ناگفتہ بہ سلوک روا رکھا گیا تھا۔ یزید نے سوچا کہ امام زین العابدینؑ کو (اسیری

[1] بحارالانوار، ج ۴۵، ص ۱۱۸

کی حالت میں) اپنے ساتھ مسجد میں لے جائے تاکہ لوگوں کے سامنے امامؑ کو نفسیاتی اعتبار سے کمزور کر سکے اور کوئی ایسا کام کرے کہ اس کے مخالفین اور امامؑ کے چاہنے والے جو ہر جگہ موجود تھے وہ اس کی حکومت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔

اس موقع پر امام زین العابدینؑ نے یزید سے مخاطب ہو کر کہا: اجازت دو تو میں بھی ان لکڑیوں پر چڑھ کر ان لوگوں سے کچھ باتیں کروں"۔ یزید سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ فرزند رسولؐ، ایک ایسا جوان جو اسیر بھی ہے اور بیمار بھی، جو اس پوری مدت میں جسمانی اور نفسیاتی طور پر کافی کمزور ہو چکا ہے وہ اس کے لئے کسی قسم کو کوئی خطرہ پیدا کر سکتا ہے۔

یزید نے امام عالی مقامؑ کو اجازت دی اور آپؑ منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں کے سامنے فلسفہ امامت اور واقعہ کربلا کو بیان کرتے ہوئے بنو امیہ کی حکومت کی سیاہ کاریوں کو خود انہی کی حکومت کے مرکز میں فاش کر دیا۔ (یعنی) امامؑ نے ایک ایسا کام کر دیا کہ اہل شام میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگے۔

امام زین العابدینؑ ایک ایسی عظیم شخصیت ہیں جو عبید اللہ ابن زیاد، اور شام کے فریب خوردہ لوگوں کے جلسہ عام میں یزید کے حکومتی کارندوں کی موجودگی میں بغیر کسی خوف کے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے حق اور سچ بات کہہ دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی نظر میں زندگی کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

امام زین العابدینؑ نے اسیری اور بیماری کے باوجود کسی عظیم مرد مجاہد کی طرح اپنے قول و فعل کے ذریعے شجاعت و دلیری کے بہترین نمونہ پیش کئے ہیں۔ اس دوران آپؑ کا طرز عمل آپؑ کی عام زندگی سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کی زندگی کے اصلی دور میں آپؑ کی حکمت عملی مستحکم بنیاد پر بڑے نپے تلے انداز میں نرم روی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف

آگے بڑھنا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات آپؑ عبدالملک بن مروان کے ساتھ نہ صرف ایک محفل میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ آپؑ کا رویہ بھی نرم نظر آتا ہے جب کہ اس مختصر مدت (ایام اسیری) میں آپؑ کے اقدامات بالکل کسی پر جوش انقلابی کی مانند نظر آتے ہیں جس کے لئے کوئی معمولی سی بات بھی برداشت کر لینا ممکن نہ ہو، لوگوں کے سامنے، بھرے مجمع میں بھی مغرور اور اقتدار کے نشے میں بدمست دشمن کو دندان شکن جواب دینے میں ذرہ برابر بھی نہیں ہچکچاتے۔

کوفہ کا درندہ صفت خونخوار حاکم، عبید اللہ ابن زیاد جس کی تلوار سے خون ٹپک رہا ہے جو فرزند رسولؐ امام حسینؑ اور ان کے اعوان وانصار کا خون بہا کر مست ہو چکا ہے اور کامیابی کے نشے میں بالکل چور ہے اس کے مقابلے میں آپؑ ایسا بے باک اور سخت لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں کہ ابن زیاد آپؑ کے قتل کا حکم جاری کر دیتا ہے اس وقت اگر جناب زینبؑ ڈھال بن کر آپؑ کے سامنے آ کر یہ نہ کہتیں کہ میں اپنے جیتے جی ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی اور ایک عورت کے قتل کا مسئلہ نہ ہوتا، نیز یہ آپ کو قیدی کی حیثیت سے دربار شام میں حاضر کرنا مقصود نہ ہوتا تو عجب نہیں ابن زیاد امام زین العابدین عَلَیْہِ السَّلَام کے خون سے بھی اپنے ہاتھ کو رنگین کر لیتا۔

بازار کوفہ میں آپؑ اپنی پھوپھی جناب زینبؑ اور اپنی بہن جناب سکینہ کی آواز میں آواز ملا کر خطبہ ارشاد فرماتے ہیں لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں اور حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ اسی طرح شام میں چاہے وہ یزید کا دربار ہو یا مسجد میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم، بڑے ہی واضح الفاظ میں دشمن کی سازشوں سے پردہ اٹھا کر حقائق کا برملا اظہار کرتے ہیں چنانچہ آپ کے ان تمام خطبوں اور تقریروں میں اہل بیتؑ کی حقانیت، خلافت کے سلسلہ میں ان کا استحقاق اور یزید

ی حکومت کے جرائم اور ظلم وزیادتی کا پردہ چاک کرتے ہوئے نہایت ہی تلخ اور درشت لب و لہجہ میں غافل اور ناواقف عوام کو جھنجوڑنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

یہاں ان خطبوں کو نقل کرکے امامؑ کی فکر کی گہرائی پیش کرنے کا وقت نہیں، کیونکہ یہ خود ایک مستقل کام ہے اور اگر کوئی شخص ان خطبوں کی تشریح و تفسیر کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان بنیادی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایک لفظ کی تحقیق اور چھان بین کرے۔ یہ ہے امام زین العابدینؑ کی اسارت اور قید وبند کی زندگی جو جرات وہمت اور شجاعت و دلاوری سے معمور نظر آتی ہے۔

ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات تھیں جن کے پیش نظر امامؑ کے موقف میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ اب قید سے چھوٹ کر آپ نہایت ہی نرم روی کا مظاہرہ کرتے ہیں، تقیہ سے کام لیتے ہیں، اپنے تیز و تند انقلابی اقدامات پر دعا اور نرم روی کا پردہ ڈال دیتے ہے تمام امور بڑی خاموشی کے ساتھ انجام دیتے ہے جبکہ قید وبند کے عالم میں آپ نے ایسے دلیرانہ عزائم کا اظہار اور مخاصمت آمیز اقدام فرمائے ہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک استثنائی دور تھا یہاں امام سجادؑ کو فرائض امامت کی ادائیگی اور حکومت الٰہی و اسلامی کی تشکیل کے لئے مواقع کی فراہمی کے ساتھ عاشورا میں بہنے والے بے گناہوں کے خون کی ترجمانی بھی کرنی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں سید سجادؑ کے ذہن اقدس میں ان کی اپنی زبان نہ تھی بلکہ شمشیر سے خاموش کر دی جانے والی امام حسینؑ کی زبان، اس وقت کوفہ وشام کی منزلوں سے گزرنے والے اس انقلابی جوان کو ودیعت کر دی گئی تھی۔ چناچہ اس منزل پر اگر امام زین العابدینؑ خاموش رہتے اور اس جرات اور ہمت اور جواں مردی وبے باکی کے ساتھ حقائق کی وضاحت کرکے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ کر دیتے تو آیندہ آپ کے

مقاصد کی تکمیل کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ جاتی کیونکہ یہ امام حسینؑ کا جوش مارتا ہوا خون ہی تھا جس نے نہ صرف آپؑ کے لئے میدان ہموار کر دیا بلکہ تاریخ تشیع میں جتنی بھی انقلابی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان سب میں خون امام حسینؑ کی گرمی شامل نظر آتی ہے۔ چناچہ امام زین العابدینؑ سب سے پہلے لوگوں کو موجودہ صورت حال سے خبردار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ آئندہ اپنے اسی عمل کے سایہ میں بنیادی، اصولی، عمیق اور ایک طویل حکومت اور باطل مخالف تحریک کا سلسلہ شروع کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ تیز و تند زبان استعمال کئے بغیر لوگوں کو متنبہ اور ہوشیار کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس قید و بند کے سفر میں حضرت امام زین العابدینؑ کا کردار جناب زینبؑ کے کردار سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ دونوں کا مقصد حسینی انقلاب اور پیغامات کی تبلیغ و اشاعت ہے اگر لوگ اس بات سے واقف ہو جائیں کہ امام حسینؑ قتل کر دیئے گئے، کیوں قتل کر دیئے گئے؟ اور کس طرح قتل کیے گئے تو آئندہ، اسلام اور اہل بیت علیہم السلام کی دعوت ایک نیا رنگ اختیار کر لے گی لیکن اگر عوام ان حقیقتوں سے ناواقف رہ گئے تو انداز کچھ اور ہو گا۔ لہٰذا معاشرے میں ان حقائق کو عام کرنے اور صحیح طور پر حسینی انقلاب کو پہچنوانے کے لئے اپنا تمام سرمایہ بروئے کار لا کر جہاں تک ممکن ہو سکے اس کام کو انجام دینا ضروری تھا۔

امام زین العابدینؑ کا وجود نہ صرف جناب سکینہ و جناب زینبؑ بلکہ ایک ایک قیدی کی مانند (اپنی صلاحیت کے اعتبار سے) اپنے اندر ایک پیغام لئے ہوئے ہے۔ ضروری تھا کہ یہ تمام انقلابی قوتیں یکجا ہو کر غربت و بیکسی میں بہائے جانے والے حسینیؑ خون کی سرخی کربلا سے لے کر مدینہ تک تمام بڑے اسلامی مراکز میں پھیلا دیں۔ اور جب امام سجادؑ مدینہ میں داخل ہوں، لوگوں کی بے چین اور متجسس نگاہوں، چہروں اور زبانوں کے جواب میں آپؑ ان کے سامنے

حقائق بیان کریں اور یہ امامؑ کی آئندہ مہم کا اولین نقشہ ہے۔ اسی لئے ہم نے امام زین العابدینؑ کے اس مختصر دور حیات کو ایک استثنائی دور سے تعبیر کیا ہے۔ اس مہم کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپؑ مدینہ رسولؐ میں ایک محترم شہری کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور اپنے کام کی ابتداء پیغمبر اسلامؐ کے گھر اور آپؐ کے حرم (مسجد النبی) سے کرتے ہیں۔ حضرت امام سجادؑ کے آئندہ موقف اور طریقہ کار کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی حالت و کیفیت اور اس کے تقاضوں پر بھی ایک تحقیقی نظر ڈالی جائے چنانچہ اس موضوع پر آگے روشنی ڈالیں گے۔

مآخذ

- القرآن الکریم، ترجمہ جوادی، ذیشان حیدر، انصاریان پبلیکیشنز، قم، ۱۴۲۴ق
- نہج البلاغہ، ترجمہ مفتی جعفر حسین، محمد علی فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ع
- آبی، منصور بن حسین، نثر الدر، الہیئۃ المصریہ العامہ للکتاب، قاہرہ، ۱۳۶۰ش
- ابن ابي الحدید، عبد الحمید بن ہبۃ اللہ، شرح نہج البلاغہ، مکتبۃ آیۃ اللہ المرعشي النجفي، قم، ۱۴۰۴ق
- ابن حیون، نعمان بن محمد مغربي، دعائم الاسلام، مؤسسۃ آل البیت علیہم السلام، قم، ۱۳۸۵ق
- ابن شعبہ، حسن بن علی، تحف العقول، جامعہ مدرسین، قم، ۱۴۰۴ق
- ابن شہر آشوب مازندرانی، محمد بن علی، مناقب آل اَبي طالب علیہم السلام، علامہ، قم، ۱۳۷۹ق
- ابن ہشام، عبد الملک، سیرۃ النبویہ، کتابچی، تہران، ۱۳۷۵ش
- بحرانی اصفہانی، عبد اللہ بن نور اللہ، عوالم العلوم والمعارف، مؤسسۃ الإمام المہدی عجّل اللہ تعالی فرجہ الشریف، قم، ۱۳۸۴ش
- تمیمی آمدی، عبد الواحد بن محمد، غرر الحکم ودرر الکلم، دار الکتاب الإسلامی، قم، ۱۴۱۰ق
- حکیمی، محمد رضا و علی، الحیاۃ، ترجمہ احمد آرام، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۸۰ش
- السید محسن الامین، اعیان الشیعہ، دار التعارف للمطبوعات، بیروت، ۱۴۰۳ق
- سید بن طاوس، اللہوف، موسسہ فرہنگی و اطلاع رسانی تبیان، قم، ۱۳۸۷ش

- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، شرح اصول کافی، مؤسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی، تہران، ۱۳۸۳ ش
- طبرسی، احمد بن علی، الاحتجاج علی اہل اللجاج، نشر مرتضی، مشہد، ۱۴۰۳ق
- علوی، محمد بن علی بن الحسین، المناقب، دلیل ما، قم، ۱۴۲۸ق
- کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ترجمہ مصطفوی، کتاب فروشی علمیہ اسلامیہ، تہران، ۱۳۶۹ش
- کراجکی، محمد بن علی، التعجب من أغلاط العامۃ في مسألۃ الإمامۃ، دار الغدیر، قم، ۱۴۲۱ق
- مجلسی، محمد باقر بن محمد تقی، بحار الانوار، دار إحیاء التراث العربي، بیروت، ۱۴۰۳ق
- مجلسی، محمد تقی بن مقصود علی، روضۃ المتقین فی شرح من لایحضرہ الفقیقہ، مؤسسہ فرہنگی اسلامی کوشانبور، قم، ۱۴۰۶ق
- مدنی، سید علی خان، الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعہ، مکتبہ بصیرتی، قم، ۱۳۹۷ق.

فہرست